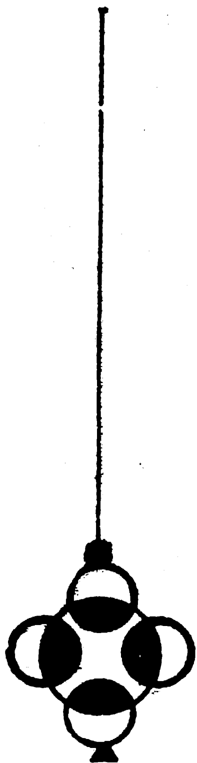
صدق جائسی



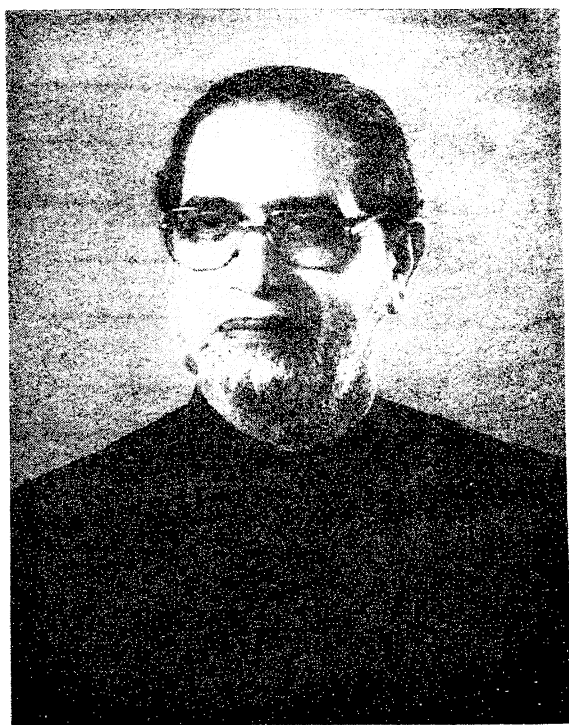
محمد نور الدین خاں

سلسلۂ مطبوعات ادبستانِ دکن

نام کتاب : صدق جائسی
مؤلف : محمد نور الدین خاں
تعداد صفحات : (۱۴۴)
تعداد اشاعت : پانچ سو (۵۰۰)
سنہ اشاعت : جنوری ۱۹۹۴ء
قیمت : پچاس روپیہ /50 :RS
کتابت : محمد عبد الرؤف
سرورق : ریاض ۔ آرٹ سرورق : ولی محمد صدیقی
طباعت : لیتھو دائرہ پریس چھتہ بازار ۔ حیدرآباد
طباعت سرورق : چیرشمہ پرنٹر ۔ خیریت آباد
جلد سازی : حفیظیہ بک بائنڈنگ ورکس، چھتہ بازار حیدرآباد
زیر اہتمام : محبوب علی خاں اخگر قادری

ملنے کے پتے :

۱: حسامی بک ڈپو مچھلی کمان ۔ حیدرآباد دکن
۲: اسٹوڈنٹس بک ہاؤس چار کمان حیدرآباد دکن
۳: مکان مؤلف ۔ مکان نمبر ۳۵۶ ۔ ۶ ۔ ۲۰
دیوڑھی نواب شرف جنگ فیاض چبوترہ سید علی حیدرآباد اے پی انڈیا
فون نمبر : 526423
۴: پرویز فیاکس سروسیس، مغلپورہ 0842 - 526285



مُحَمَّد نُورُالدّین خان

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

حضرت شبلی یزدانی

کے

نام

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!



شبلی یزدانی

صدق جائسی — چہرا مہرا — عادتیں

قد متوسط ۔ جسم دُھرا ۔ رنگ گندمی ۔ چہرے کے نقوش دلکش مگر چیچک کے داغ بھی ۔ بہت جامہ زیب ۔ ہمیشہ شیروانی اور سفید پاجامہ زیب تن ۔ سر پہ رومی ٹوپی کبھی ننگے سر بال جمے ہوئے سیدھی مانگ نکلی ہوئی پان کا زیادہ شوق مگر زردہ کی آمیزش لازمی ۔ سگریٹ پیتے تھے ۔ شراب سے گریزاں ۔ ظریف الطبع اور ہنس مکھ ۔ خوش بیانی ایسی کہ وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی ۔ !

یادداشت

حیدرآباد کے ہمہ داں بزرگ صحافی حضرت شبلی یزدانی سے میرا تعارف بہ توسط و بہ طفیل میرے کرم فرما مخلص دوستوں جناب سید عبدالحفیظ صاحب مرحوم اور مولوی عبدالقادر صاحب اورنگ آبادی سنہ ١٩٨٠ء میں ہوا۔ یہ دونوں صاحبین حضرت شبلی کے بڑے بے تکلف قدیم دوستوں میں تھے۔ بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک بار ان سے ملو تو بار بار ملنے کو جی چاہے۔ حضرت کی بھی ایسی ہی بڑی جامع الصفات پُرکشش شخصیت تھی۔ علم و فضل سے بہرہ مند، ذوق شعر و ادب سے آراستہ، ذہانت و خوش طبعی کے جوہر خداداد سے کما حقہٗ متصف۔ عُمر چوراسی ۸۴ سے زیادہ ہو چکی تھی لیکن حافظہ حیرت انگیز طور سے بڑا قوی تھا۔ عمر گزشتہ کی ایک ایک بات ایسی یاد تھی جیسے کل کی بات ہو۔ میں اکثر ان کے مکان واقع خیریت آباد اس ذوق و شوق سے جاتا تھا جس طرح بلا گشتان محبت بکوئے یار روند۔ گھنٹوں خدمت میں بیٹھتا۔ معلومات کے طلسم اور خوش بیانی کی سحر آفرینی میں ایسا محو ہو جاتا کہ بھوک پیاس کا بھی احساس نہ ہوتا اور جب بادلِ نخواستہ اٹھتا تو کچھ دل ہی جانتا کہ کس دل سے اُٹھنا پڑا۔

حضرت ایک مُدت سے خانہ نشین اور گوشہ گیر ہو گئے تھے۔ لوگوں سے مِلنا جُلنا موقوف ہو گیا تھا لیکن میں جاتا تو بڑی شفقت اور عزت سے خوش آمدید کہتے۔ ایسا معلوم ہوتا گویا میرے مشتاق و منتظر بیٹھے ہوں۔ میرے ادبی کام کو دیکھ کر خوش ہوتے۔

ایک دن صدق جائسی کی تالیف "دربار دُربار" کا ذِکر آگیا تو کتاب کی بہت تعریف کی اور صاحب کتاب کو بھی سراہا۔ کہنے لگے جب وہ چادر گھاٹ ہائی اسکول

میں پڑھتے تھے تو صدق جائسی اردو کے استاد ہو کر آئے۔ اپنے دل نشین درس و تدریس اور خوش بیانی کی بدولت بہت جلد طالب علموں میں ہر دلعزیز ہو گئے۔ جب صدق "لکڑی کا پُل" میں ایک کرایہ کے مکان میں فروکش ہوئے تو حضرت شبلی بر بنائے ذوق شعر و ادب اپنے استاد سے ملنے گھر جاتے تھے۔ صدق، شاگرد کے ذوق کو دیکھ کر اپنا کلام سناتے تھے۔ حضرت شبلی نے ایک یادگار کام یہ کیا کہ جب بھی صدق اپنا کلام سناتے تو یہ اپنی بیاض (نوٹ بک) میں نوٹ کر لیتے اگر کوئی ہجو سنانی ہوتی تو ہجو کا بیاک گراونڈ ضرور سمجھاتے کہ کس کی ہجو ہے کیوں لکھنی پڑی اس لیے کہ بغیر تشریح ہجو کا لطف نہیں آ سکتا۔ صدق اپنے لکھے ہوئے کلام کو ایک نظر دیکھ بھی لیتے تاکہ کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ جناب صدق کی نظر عنایت اپنے عزیز شاگرد شبلی پر ایسی رہی کہ وہ انہیں اپنے ساتھ حضرت ابو الاعلیٰ مودودی کے گھر خاص دوستوں کی محفل میں لے جاتے تھے جب صدق کا تبادلہ اورنگ آباد ہو گیا تو یہ دلچسپ صحبتیں ختم ہو گئیں لیکن اتنا ہوا کہ صدق کا کلام بیاض میں محفوظ ہو گیا۔ اور اس کی تشریحات حضرت شبلی کے ذہن میں نقش کا الحجر بن کے رہ گئیں۔ موصوف اپنے ذخیرۂ کتب سے بیاض نکال کر بڑے پُر لطف انداز سے سناتے تھے۔ ہجو ہوتی تو تشریح کر دیتے تھے۔

حضرت شبلی کو شدید احساس تھا کہ صدق جائسی کی شخصیت، ان کے حالات اور شاعری پر کسی نے کچھ نہیں لکھا حالانکہ ہم عصر شاعروں اور ادیبوں میں بعض سے دوستانہ مراسم اور شخصی روابط تھے۔ تذکرہ نگاروں نے بھی انہیں نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے مجھ سے خواہش کی کہ کم از کم جناب صدق کا سوانحی خاکہ ان کے کلام کے ساتھ مرتب و شائع کر دوں اگرچہ کہ وہ ایک کتابچہ کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ میں نے بھی اپنے نزدیک یہی سوچا کہ حضرت کی خواہش کا احترام کر دوں اور موقع کو غنیمت جان کر کام شروع کر دوں تاکہ ایک قیمتی ادبی سرمایہ محفوظ ہو جائے۔ میں نے حضرت سے وعدہ کیا کہ اس کام میں اگر وہ میری رہبری کریں تو یہ ادبی خدمت میں انجام دوں گا۔ حضرت نے خوش ہو کر

کلام کے زیراصلاح لینے کی اجازت دی۔ چنانچہ مَیں نے کام شروع بھی کر دیا۔ نوٹس لکھ کر انہیں دکھاتا تو وہ میری رہبری کرتے اور حوصلہ افزائی بھی۔ مذاق سے ایک دن کہا کہ جو کلام صدق کا پچاس سال پہلے اتنے شوق سے لکھ رہا تھا تو کیا معلوم تھا کہ وہ سارا کلام آپ کو دینے لکھ رہا تھا۔

صدق نے راجہ صاحب محمود آباد اور نواب صاحب پریادان کی مدح میں جو قصائد لکھے تھے انھیں کتابچہ کی صورت میں "جواہر الصدق" کے نام سے شائع کیا تھا مگر افسوس باوجود کوشش دستیاب نہ ہو سکی۔

کام جاری تھا مگر میرے تساہل کی وجہ رفتار مدھم اور سُست تھی اُدھر وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ آخر کار دائمی جُدائی کی گھڑی اچانک آ گئی اور حضرت شبلی ۱۵ر جولائی ۱۹۹۲ء اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ بربنائے روابط مخلصانہ و نیازمندی میرے لیے یہ صدمۂ جانکاہ تھا۔ کام دھرے کا دھرا رہ گیا اور چند مہینے معرضِ التوا میں پڑ گیا۔ طویل خاموشی کے بعد مجھے حضرت سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا اور مَیں نے پھر سے کام کا آغاز کر دیا۔

صدق جائسی پُرگو شاعر تھے۔ تقریباً جملہ اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے کافی ضخیم دیوان یقیناً ہو سکتا ہے۔ چنانچہ محترم پروفیسر خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد مُدیر ماہ نامہ سب رس کراچی نے میرے ایک استفسار پر اپنے خط میں تحریر فرمایا:

"صدق صاحب کی اکلوتی بیٹی میرے ہاں دو سال قبل آئی تھیں۔۔۔۔ کبھی کبھار میرے ہاں آتی ہیں۔ فون پر بھی بات ہوتی ہے۔ وہ ہندوستان بھی گئی تھیں اور وعدہ کیا تھا کہ صدق صاحب کا کلام ساتھ لائیں گی مگر وہ نہ لا سکیں"۔

ظاہر ہے سارا کلام دست بُرد زمانہ سے ضائع ہو گیا ہوگا۔

جو غزلیں اس کتاب میں شامل ہیں ان میں سے چند حضرت شبلی کی بیاض سے لی ہوئی ہیں اور چند غزلیں مختلف رسائل سے حاصل کی گئی ہیں۔ یہ سب کی سب مطبوعہ ہیں۔ غزلوں کا ابھی وافر ذخیرہ قدیم رسائل میں موجود ہے

جو بوجہ ہماری سہل انگاری اس کتاب میں شائع ہونے سے رہ گیا۔ غزلوں کو چھوڑ کر باقی سارا کلام غیر مطبوعہ ہے جو حضرت شبلی کی بیاض سے حاصل ہوا۔ یہ جو بھی کلام ہے غنیمت ہے۔ مخطوطہ تھا اب مطبوعہ کا لباس پہن کر محفوظ ہوگیا جناب صدق کے ہاتھ سے لکھی ہوئی غزل اور خود نوشتہ خط کے عکس بھی کتاب میں شریک کرنا میں نے مناسب سمجھا جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی حضرت شبلی کی عطا کردہ ہیں۔ میں نے ایک ادبی کام سمجھ کر یہ کتاب مرتب و شائع کی ہے اُمید کہ جناب صدیق جائسی اور ان کی شاعری کو سمجھنے یہ "تالیف مددگار ثابت ہوگی۔ جناب احمد علی خاں صاحب ادیب حیدرآبادی کا بہت ممنون ہوں کہ از راہ علم نوازی اپنے گراں قدر مضمون کو اس کتاب میں شامل و شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اس تالیف کا مسودہ میں نے میرے دوست جناب محبوب علی خان صاحب اخگر کے حوالے کر کے بیٹھ رہا۔ ان کا بہت شکر گزار ہوں کہ بڑے خلوص اور مستعدی سے انھوں نے کتاب کی اشاعت تک کے سارے مرحلے طے کئے اور مجھے طوافِ کوئے کاتب و مطبع کی زحمتوں سے بچادیا۔

محمد نورالدین خاں

20-6-356 چبوترہ سید علی حیدرآباد

جناب صدق جائسی

اردو کے متاخرین شعراء میں صدق جائسی ایک باکمال لیکن فراموش روزگار شاعر گزرے ہیں جن کو انتقال کئے ہوئے کچھ زیادہ زمانہ نہیں کم و بیش چوبیس ۲۴ سال ہوتے ہیں۔ عمر کا ایک حصہ انھوں نے شمالی ہند کے رئیسا و امراء یعنی نواب صاحب پریاوان، نواب صاحب ددجانہ، نواب صاحب بھوپال اور راجہ صاحب محمود آباد وغیرہ کی مصاحبت اور درباداری میں گزارا اور عمر کے آخری چھبیس ۲۶ سال حیدرآباد میں اسی طرح گزارے کہ اہل علم کے ہر طبقہ میں مقبول و معروف، اعلیٰ عہدہ دار اور وزرائے حکومت ان کے قدرداں یہاں تک کہ شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر کے اعزازی مصاحب اور دربار کے حاضر باش، خوش گو اور خوش فکر شاعر تھے۔ ہندوستان کے چوٹی کے ماہناموں اور مجلوں میں ان کا کلام شائع ہوتا۔ مشاعروں میں ان کی شرکت اور شعر و سخن کی محفلوں میں ان کی آمد و رفت رہتی لیکن حیرت کا مقام ہے کہ ان کے حالات زندگی اور ان کی خصوصیات شعری، شعرا کے کسی تذکرہ میں نہیں ملتے۔ لے دے کے ان کے ایک شاگرد عزیز جناب احمد علی خاں ادیب حیدرآبادی نے پہلی مرتبہ ان کے انتقال کے دو ماہ بعد ماہنامہ سب رس (حیدرآباد) مارچ سنہ ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں اپنے استاد محترم کی یاد میں ان کے شخصی محاسن پر ان کے نمونہ کلام کے ساتھ ایک مضمون شائع کیا جو اگرچہ دلچسپ ہے مگر ان کی زندگی کے ضروری تفصیلات نہیں ملتے۔" قصیدہ نگاران اتر پردیش" کے نام سے چارسو چوبیس ۴۲۴ شعرا کا تذکرہ جناب سید علی جواد زیدی نے سنہ ۱۹۷۵ء

میں تالیف و طبع کیا ہے ان شعراء کی فہرست میں جناب صدق کا نام تو ملتا ہے مگر صرف تاریخ وفات کا ذکر ہے ان کے حالاتِ زندگی تو کجا شاعری کی نسبت ایک شعر بھی نہیں لکھا جس سے ان کے کمال شاعری کا اندازہ ہوتا۔ حیدرآباد میں جہاں بہت سے شعراء اور اہلِ قلم سے جناب صدق کے دوستانہ تعلقات تھے۔۔ وہاں جوش ملیح آبادی اور ماہر القادری سے بھی برسوں دوستانہ مراسم اور روزانہ کی ملاقاتیں رہتی تھیں لیکن جوش نے اپنی سرگزشت "یادوں کی برات" میں جہاں نام بنام اپنے بہت سے دوستوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اور ان کے مختصر و مخصوص حالات لکھے ہیں وہاں صدق کا نام تک نہیں ہے حالانکہ "دربار دُربار" میں جوش کو ایک موقع پر صدق نے بڑی محبت سے یاد کیا ہے ؎

بہت آتی ہے یاد اے جوش تیری ؛ خدا خوش رکھے تجھ کو تو جہاں ہے

اسی طرح ماہر القادری نے "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے اپنے رسالہ "فاران" میں بیسیوں مشاہیر، علماء و فضلاء اور شعراء کی رحلت پر متعدد تعزیتی مضامین لکھے ہیں لیکن جناب صدق کے بارے میں دو سطر بھی کہیں نہیں ملتے۔ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے زیرِ اہتمام جنوری ۱۹۸۶ء میں منعقدہ سیمینار میں اہلِ علم اصحاب نے بیرونی شعراء پر مضامین پڑھے جو حیدرآباد آئے۔ یہ مضامین زیرِ نگرانی پروفیسر محترمہ سیدہ جعفر سنہ ۱۹۸۸ء بعنوان "حیدرآباد میں بیرونی شعراء" شائع ہوئے لیکن پوری کتاب میں جناب صدق کا کہیں نام نہیں ~~سلسلہ~~ حضرت معز قادری الملتانی صاحب کا معلومات افروز مضمون "ماہر القادری" اس کتاب کی زینت ہے جس میں حضرت نے نواب معظم جاہ بہادر کے دربار سے وابستہ شعراء کے نام تحریر فرمائے ہیں۔ ان شعراء میں صدق کا نام نظر نہیں آتا جب کہ صدق، حضرت فانی بدایونی کی طرح اعزازی مصاحب تھے اور تقریباً ۸ سال تک نواب معظم جاہ کے شاہانہ دربار سے وابستہ رہے جناب صدق نے قیام حیدرآباد کے ضمن میں اپنے کچھ حالات لکھے ہیں لیکن حیدرآباد آنے سے پہلے اور یہاں سے جانے کے بعد کے اہم تفصیلات کچھ نہیں لکھے۔

شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ کے دربار کے حالات نہایت دلچسپ انداز میں لکھے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں ان کی شاعری سے متعلق ایک نئی دریافت یہ ہوئی کہ وہ علاوہ قصائد، غزلیات وغیرہ کے ہجو بھی کہتے تھے جس میں ان کو واقعی کمال حاصل تھا ان کی غزلیات تو ڈھونڈ سے اردو کے پرانے رسالوں میں مل جاتے ہیں لیکن کوئی ہجو کسی رسالے میں شائع نہیں ہوئی۔ صرف دربار دُربار میں ایک ہجو کے چند اشعار ملتے ہیں جو شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ کی فرمائش پر ان کے دربار میں سنائے گئے تھے اور سارے درباری لُطف اندوز ہوئے اور مارے ہنسی کے ان کا بُرا حال ہوا۔

اتفاق کی بات ہے کہ جناب صدق کا بہت سا کلام ان کے ایک قریبی شاگرد اور سابق سب ایڈیٹر رہنمائے دکن جناب شبلی یزدانی صاحب کے پاس محفوظ تھا جو تقریباً سارے اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ ان کے اس مجموعہ کلام میں وہ تمام ہجویں ہیں جو انہوں نے مختلف اوقات میں بعض شخصیتوں کے بارے میں کہی ہیں جو کسی رسالے اور کسی اخبار میں شائع نہ ہوسکتی تھیں صرف ان کے حافظہ میں رہ گئیں۔ وہ اپنے بے تکلف احباب کی مجلس میں سنایا کرتے تھے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ ہجویں ایسی شستہ اور مہذب پیرایہ میں لکھی ہیں کہ وہ بعض حضرات جن کی شان میں جو ہجویں لکھی گئی تھیں جناب صدق کی زبانی سُن کر دادِ تحسین دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ زمانہ نے جناب صدق کو بھلا دیا۔ ان کے ساتھ اگر ان کا کلام بھی بھلا دیا جائے تو اردو شاعری کا ایک قیمتی سرمایہ ضائع جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی ارادہ ہوا کہ جناب صدق کے جو کچھ مصدقہ حالات و معلومات مختلف ذرائع سے فراہم ہوں انہیں ترتیب دے کر ان کے کلام کے ساتھ شائع کردیں۔ کہ

نام نیکو رفتگان ضائع مکن ؟

جائس ضلع رائے بریلی کا ایک مردم خیز قصبہ ہے۔ یہیں وہ پیدا ہوئے اور یہیں پروان چڑھے۔ ان کا نام نامی مرزا تصدق حسین تھا۔ ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم کس درس گاہ میں پائی یہ کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ بہرحال ان

کی عمر کا ایک بڑا حصّہ شمالی ہند میں گزرا۔ وہ پہلے پہل سنہ ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد وارد ہوئے اور اپنی شاگردی کی نسبت سے استاذ السلطان جلیل القدر نواب فصاحت جنگ جلیل کی دیوڑھی جلیل منزل بازار نورالامراء میں مہمان بطور فرد کش ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حیدرآباد میں ترقی تعلیم کا ہر طرف چرچا تھا۔ بلدہ و اضلاع میں نئے مدارس کھل رہے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے ساتھ دارالترجمہ کے قیام کو چند ہی سال ہوئے تھے۔ سارے ہندوستان میں اس کی شہرت تھی گوشے گوشے سے مشاہیر علم و فضل بلائے جا رہے تھے اور بہت سے اپنے طور پر ملازمت کی تلاش و کوشش میں چلے آئے تھے۔ جناب صدق نے بھی اس مقصد سے حیدرآباد کا رُخ کیا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری کے امیدوار تھے۔ جلیل منزل میں قیام کے دوران جو آٹھ ماہ تک رہا حیدرآباد کے با اثر حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کر چکے تھے مہاراجہ کشن پرشاد پیشکار دولت آصفیہ کے دربار میں بھی رسائی تھی — مہاراجہ اہلِ علم کے نہ صرف قدر دان تھے بلکہ حتی الوسع ان کی دستگیری بھی کیا کرتے تھے مگر ان دنوں صدارت عظمیٰ سے سبکدوش تھے۔ جناب صدق کی مدد سے قاصر رہے۔ ریاست حیدرآباد میں ملازمت کے لیے صداقت نامہ ملکی کا لزوم تھا۔ بیرونی افراد کے لیے حصول ملازمت میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ جناب صدق ملازمت کے لیے کوشاں تھے اس اثنا میں انہوں نے بڑی کوشش و کاوش سے صداقت نامہ ملکی تو حاصل کر لیا مگر حیدرآباد میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی جس سے محفوظ رہنے کے لیے انہیں ناچار وطن لوٹ جانا پڑا۔ وہاں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ ایک دو ماہ نہیں، لگاتار چار سال گزر گئے۔ حیدرآباد کی کشش ایسی رہی کہ وہ یہاں آئے بغیر نہ رہے اس مدت مدید میں حیدرآباد کے حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ چودہ برس کی سبکدوشی کے بعد مہاراجہ کشن پرشاد پھر صدارت عظمیٰ پر فائز ہوئے جس سے حیدرآباد کے عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس موقع کو غنیمت جان کر جناب صدق نے ایک قطعہ تہنیت لکھا اور مہاراجہ کے ہاں پہنچ کر سرِ دربار اپنے خاص انداز میں سُنایا۔ اہلِ دربار اپنی جگہ لطف اندوز ہوئے اور خود مہاراجہ اس

درجہ متاثر ہوئے کہ شادان و فرحان اپنی مسند سے سرو قد اٹھ کر داد تحسین دی۔

چودہ برس کے بعد ہی چودھویں کا چاند
پرتو فگن ہے پھر شرف آفتاب میں

اِدھر جامعہ عثمانیہ میں جناب صدق کے تقرر کا مسئلہ درپیش تھا انھیں قوی امید تھی کہ مہاراجہ کی توجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن ایک مشکل یہ آ پڑی تھی کہ جامعہ عثمانیہ میں پروفیسری یا لکچراری پر تقرر کے لیے سند قابلیت درکار تھی جس سے استثنا کی کوئی صورت نکل نہ سکی۔ بالآخر جناب صدق اس کے متبادل کسی اور جائیداد پر تقرر کے لیے مہاراجہ کا تعاون چاہتے تھے جس کا وعدہ بھی تھا۔ مگر اس میں تاخیر پر تاخیر ہو رہی تھی جو جناب صدق کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ ان کا پیمانۂ صبر چھلک گیا۔ ایک شکوی آمیز قطعہ لکھا اور بھرے دربار میں مہاراجہ کو پیش کیا۔ انہوں نے صدق کی زبانی سننے کی خواہش کی۔

پھر کیا تھا جناب صدق نے بہت جوش و خروش سے وہ قطعہ پڑھا۔ ابتدا کے چند شعر مدح و توصیف میں تھے وہ مہاراجہ نے بڑے شوق سے سنے۔ جب آگے یہ چبھتے ہوئے شعر پڑھے گئے:

شرم آتی ہے جو احباب کبھی پوچھتے ہیں
آج تیرے لیے کیا کوئی بھی نکلی نہ سبیل

دم ہے سینے میں خفا اتنی بھی تاخیر ہے کیا
گویا تاخیر ہے مقصد پہ دلدہی کی دلیل

شوق بے تاب اِدھر اور تمنا بے تاب
مدتِ وعدۂ جاں بخش اُدھر طول طویل

ایسے وعدے کو ہے درکار حیات الیاس
اس سے سر بچہ نہیں ہو سکتی مری عمر قلیل

مہاراجہ مسکرانے لگے۔ ان کی یہ مسکراہٹ معنیٰ خیز اور امید افزا تھی بعد چندے ان کے ایما سے جناب صدق کا تقرر مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم بلدہ کی مدرسی پر عمل میں آیا اور یہ سلسلہ ملازمت تا ختم ملازمت جاری رہا۔

جناب صدق ایک زمانہ تک "لکڑی کے پل" پر واقع نواب انتخاب جنگ کے ایک مکان میں جو موجودہ مکرم جاہ ہوسٹل کے روبرو واقع تھا کرایہ سے مقیم رہے۔ قریب ہی ان کے احباب مودودی برادران (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا ابوالخیر مودودی) آغا حیدر حسن پروفیسر اردو نظام کالج۔ عزیز احمد مددگار ناظم اطلاعات و معلومات عامہ امجد علی اشہر مولف "منظر الکرام" وغیرہ رہتے تھے۔ شام میں مولانا مودودیؒ کے مکان پر یہ سب حضرات بالالتزام جمع ہوتے۔ قاضی عبدالغفار، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر اشرف الحق عریاں بھی اکثر اس محفل میں شریک رہتے۔ بڑے دل چسپ مذاکرات ہوتے ریاست کے حالات پر تبصرہ ہوتا یا پھر اعلیٰ عہدہ داروں کا ذکر ہوتا۔ شاعری پر بحث ہوتی تو جناب صدق اپنے دل چسپ انداز میں محفل کو گرماتے۔ شریک محفل حضرات سے بڑے اچھے شعر سننے میں آتے۔ قاضی صاحب اردو کے علاوہ فارسی اشعار بھی سناتے غرض کہ یہ دل چسپ محفل رات کے سات آٹھ بجے کبھی دس گیارہ بجے تک جمی رہتی۔ مولانا مودودیؒ جب جماعت اسلامی کی تشکیل کے سلسلے میں پٹھان کوٹ منتقل ہو گئے تو یہ محفل درہم برہم ہو گئی۔ جناب صدق ابھی اس مکان میں مقیم تھے کہ ان کا تبادلہ دارالعلوم سے مدرسہ فوقانیہ انگریزی چادر گھاٹ پر ہوا جو عابد روڈ پر ایک گلی کے اندر واقع ہے۔ اس مدرسہ کے اردو اساتذہ میں جناب صدق کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ اپنے دل چسپ طریق درس اور دل نشین طرز تفہیم کے سبب طلباء میں بہت جلد مقبول و مانوس ہو گئے۔

چند دنوں بعد جناب صدق "لکڑی کے پل" کے مکان سے اٹھ کر میجر یوسف الدین

کے بنگلہ واقع رسالہ جبوش (اے سی گارڈز) کے ایک حصہ میں فروکش رہے۔ جب تک جناب صدق کی والدہ بقید حیات رہیں وہ گرما اور رمضان شریف کی طویل چھٹیوں میں جائس جایا آیا کرتے تھے۔ بعد میں جب والدہ کا انتقال ہوگیا تو اپنی اہلیہ اور خورد سالہ لڑکی کو اپنے ساتھ حیدرآباد لا چکے تھے ان کے ساتھ ان کے جوان عمر برادر نسبتی کاظم حسین بھی رہتے تھے۔ رسالہ جبوش ہی میں سنہ ۱۹۳۵ء میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا جن کی تدفین مسجد قطب شاہی خیریت آباد کے عقبی قبرستان میں ہوئی۔ اس موقع پر جناب صدق کے دوست احباب اور شاگردوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔

چند ماہ بعد رسالہ جبوش سے تخلیہ کرکے نظام کالج کے عقب میں ایک مکان کے بالائی حصہ میں آ ٹھہرے۔ اسی مکان کے دوران قیام میں شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر کے دربار سے وابستہ ہوئے ان کا کلام شہزادہ ممدوح نے فرمائش کرکے سنا اور خوب داد دی۔ ازراہ قدردانی ان کی اعزازی مصاحبت کا اعلان کیا اس اعزاز کا سہرا شوکت علی خان فانی کے سر ہے جنھوں نے شہزادہ والا شان کو جناب صدق کا ایک شعر سنا کر ان کا غائبانہ تعارف کرایا تھا۔ وہ شعر یہ تھا:

ان کے لطف عام کو غیرت نہیں کرتی قبول!
اور میں کم بخت لطف خاص کے قابل نہیں

شہزادہ والا شان کے دربار میں جہاں جناب صدق کو ڈنر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہزادہ والا شان کی ہمکلامی کا شرف حاصل تھا اور دیگر تعشات سے وہ بہرہ ور ہوتے تھے وہاں وہ رات کے خواب و راحت سے یکسر محروم رہتے کہ دربار جو رات کے آٹھ بجے سے شروع ہوتا تو نماز فجر کی اذان کو برخاست ہوتا۔ جناب صدق گھر لوٹ کر بمشکل چند لمحے استراحت کرنے پاتے کہ مدرسہ جانے کی تیاری کے لیے بڑی ناگواری سے انھیں بیدار ہو جانا پڑتا۔ سات سال کی طویل مدت اسی حال میں گزاری۔ جب شہزادہ والا شان

تین ماہ کے لیے یورپ روانہ ہوئے تو اس شاہانہ دربار داری سے نجات ملی۔

دورانِ ملازمت ایک مرتبہ جناب صدق کا تبادلہ بلدہ حیدرآباد سے ضلع بیڑ پر ہوا تھا جہاں سے وہ جلد ہی صدر المہام تعلیمات نواب مہدی یار جنگ کی مدد سے بلدہ واپس ہو گئے تھے۔ پھر ایک مدت کے بعد عادل آباد پر تبادلہ ہوا۔ انھوں نے مقامِ تبادلہ کو رجوع ملازمت ہونے کی تکلیف گوارہ نہ کی۔ چند ماہ کی طویل رخصت لے کر اس تبادلہ کو منسوخ کرایا اور پھر مدرسہ فوقانیہ انگریزی جادرگھاٹ پر کارگزار رہے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ جناب صدق کب تک اس مدرسہ پر مامور رہے۔ اور کب یہاں سے وہ اورنگ آباد تبادلہ ہو کر گئے۔ اورنگ آباد کے معتبر دانشور اور شاعر جناب مقتدر نجم صاحب افسوس کہ موصوف کا انتقال ۱۲ مئی ۹۴ء نے زمانہ طالب علمی میں جناب صدق سے اُردو پڑھی تھی اور مشاعروں میں ان کو غزل پڑھتے ہوئے سُنا۔ ان کا بیان ہے کہ غالباً سنہ ۱۹۵۲ء یا سنہ ۱۹۵۳ء میں وہ اورنگ آباد سے وظیفہ پر سبکدوش ہو کر اپنے وطن جائس روانہ ہو گئے۔
بہرحال انھوں نے اپنی ملازمت کی آخری مدت اورنگ آباد میں گزاری جس کے بعد حیدرآباد میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ اس دوران ریاست حیدرآباد کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ حیدرآباد کی وہ پُرامن فضا، خوش حالی اور آسودگی ختم ہو چکی تھی۔ وہ ادبی صحبتیں اور علمی چرچے باقی نہ رہے تھے۔ بہت سے خوش باش اور اہلِ علم حیدرآباد کو خیرآباد کہہ کے پاکستان جا چکے تھے۔ ان حالات میں وہ حیدرآباد میں کیوں کر سانس لے سکتے تھے جب کہ یہاں ان کا کوئی ہم نوا نہ ہمدرد نہ ہمسر نہ ہم خیال! "دربار دُربار" میں لکھتے ہیں حیدرآباد ایسی جگہ نہ تھی جسے کوئی خوشی سے چھوڑتا مگر مجبوری بُری ہوتی ہے آخر ایک دن وہ محبوب شہر چھوڑنا پڑا جس کے ذرہ ذرہ سے مجھے محبت تھی۔ دل اس خیال سے پاش پاش تھا کہ یہ خوب صورت شہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوٹتا ہے مگر صبر کی سِل چھاتی پہ رکھ کر ناگوار کو بھی گوارا کیا۔" (ص ۶)

بادلِ ناخواستہ وہ حیدرآباد دکن سے اپنے وطن جائس روانہ ہوئے۔ ان کی آنکھوں نے حیدرآباد کا عروج اور خوش حالی دیکھی تھی۔ دکن کی تہذیب کا

صدق جائسی

بانکپن، شعر و ادب کی محفلوں کی بہاریں اور امراء کی رنگارنگ بزم آرائیاں ان کے لیے جنت نگاہ اور فردوس گوش تھیں۔ بھلا جائیس میں ان کے لیے کیا رکھا تھا بقول ان کے وہاں علم و حکمت کی بجائے بے خبری اور جہالت کا دور دورہ تھا۔ سوسائٹی کا فقدان اور گھر کی تنہائی الگ سوہان روح تھی۔ غم دوراں بھلانے بے شغلی کا واحد شغل انھوں نے یہ نکالا کہ قلم کا سہارا لیا۔ "دربار دُربار" جیسی شہکار کتاب لکھی۔

ان کے آخری دور کے حالات زندگی گمنامی کی نذر ہو گئے۔ معلوم نہیں کہاں رہے اور کیا کیا افتاد اُن پہ پڑی۔ بالآخر گنتی کے دو چار اخبار و رسائل میں ہی یہ افسوسناک خبر چھپی کہ صدق جائسی کا ۲ جنوری ۱۹۶۷ء ۲۰ رمضان ۱۳۸۶ھ کانپور میں انتقال ہو گیا۔

ان کو کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ صرف ایک اکلوتی صاحبزادی ہیں۔ محترم پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد ایڈیٹر ماہنامہ سب رس کراچی نے مطلع فرمایا کہ جناب صدق کی صاحبزادی پاکستان میں مقیم اور بقید حیات ہیں۔ اور وہ ان سے واقف اور ملتے رہتے ہیں۔ استاد ذوق نے کیا خوب فرمایا ہے:

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے رہے یہی دو پشت چار پشت

جناب صدق کے شعر اولاد معنوی ہیں جو ان کے نام کو باقی اور زندہ رکھیں گے۔

محمد نور الدین خان



احمد علی خاں ادیبؔ

احمد علی خاں ادیب

حضرت صدق جائسی مرحوم

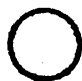
یادش بخیر استاذی مولوی مرزا تصدق حسین صاحب صدق جائسی جب اللہ کو پیارے ہو گئے تو حیدرآباد کے بیسیوں اُمرا جاگیرداروں پچاسوں گزیٹیڈ افسروں اور جائسی صاحب کے ہزار ہا عقیدت مند شاگردوں سے یہ توقع بندھی تھی کہ اخبار رہنمائے دکن اور رسالہ سب رس حیدرآباد کے ذریعہ مرحوم کے کانپور میں انتقال پُرملال کی خبر پاکر بعض اللہ کے بندے اُن کے تعزیتی جلسے کریں گے ختم قرآن و ایصال ثواب کی مجلسیں برپا ہوں گی اور ان کی یاد باقی رکھنے کے ایک آدھ منصوبے کو تو عملی جامہ پہنایا جائے گا کیونکہ مرحوم جہاں دنیائے شعر و ادب میں اپنے خداداد فضل و کمال کی بدولت عالمگیر شہرت کے مالک تھے وہاں حیدرآباد کی شائستہ ادبی محفلوں میں ہمیشہ زینتِ مجلس بنے رہے طلبائے مدارس سے قطع نظر سررشتۂ تعلیم (جس سے اُن کا ملازمت کا تعلق رہا) کے تیسرے درجے کے کلرک سے لے کر صدر اعظم وقت تک سبھی ان کے مخلصانہ برتاؤ شرقی وضعداری اور بے مثل ”جادو بیانی“ کے قائل تھے۔ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی کا یہ عالم تھا کہ روز مرہ گفتگو کرتے ہوئے بات میں بات پیدا کرنا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا جسے پھکڑپن سے دُور کا بھی واسطہ نہ ہوتا جبکہ ہجو گوئی میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اُن کی زندگی کا قابل لحاظ زمانہ دربار داری میں بسر ہوا۔ حیدرآباد کی سرکاری ملازمت ملنے سے پہلے شمالی ہند میں وہ غالباً نواب صاحب پریانواں اور پھر کسی راجہ صاحب کے دربار سے منسلک رہے۔ حیدرآباد میں سرکاری ملازمت

کہتے ہیں آ کے دِل میں تصوّر بھی شرط ہے
ہم بھی کمی کریں گے نہ اس رسم و راہ میں

انجان بن کے دوست سے اکدن نشانِ دوست
جی چاہتا ہے چھیڑ کے پوچھوں میں راہ میں

کیا بدنصیب دل ہے کہ اس باوفا کی قدر
میری نگاہ میں نہ تمہاری نگاہ میں

سُننے لگے ہیں صدق کے اشعار بزم میں
آنے لگا ہے لُطف انھیں آہ آہ میں

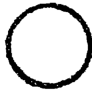


وہ عمر ہے غرور کا دِل میں گزر نہیں
ترچھی ابھی کسی کی کسی سے نظر نہیں

وہ کہہ چکے فسانۂ دِل میں اثر نہیں
اب ان سے کچھ کہے یہ کسی کا جگر نہیں

تڑپائیے سُنا کے کسی کو یہ کس لئے
مانا کہ آپ قائلِ دردِ جگر نہیں

ساری شکایتوں کا بِلا ہے جواب یہ
اوروں کو بھی گِلے ہیں مگر اس قدر نہیں



اثر دردِ نہاں کا زردیٔ رُخ سے عیاں کیوں ہو
وہ ظالم سرگراں کیوں ہو زمانہ بدگماں کیوں ہو

محبت میں موافق میرے دورِ آسماں کیوں ہو
تو ہی نامہرباں جب ہو تو کوئی مہرباں کیوں ہو

نہ تھا دورِ فراقِ یار کیا اس کے لئے یارب
زمانِ وصل ہی میں انقلابِ آسماں کیوں ہو

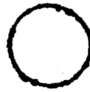
چمن سے ہٹ کے اے بلبل بنا لے آشیاں اپنا
ذرا سی بات پر برہم مزاجِ باغباں کیوں ہو

عدو بھی کر کے ناز گر گیا اُن کی نگاہوں سے
انہیں تو ضد ہے اسکی کوئی میرا ہم زباں کیوں ہو

اسے بیٹھے بٹھائے مُفت میں اک چوٹ کھانی تھی
لڑیں نظریں جہاں باہم وہاں دل درمیاں کیوں ہو

نہ ٹالو وعدۂ دیدار فردائے قیامت پر
یہیں جو بات ہو سکتی ہے وہ آخر وہاں کیوں ہو

تصور میں مرے اے صدق آ کر کہہ گیا کوئی
تمہاری جاں اگر ہم ہیں تو پھر تم نیم جاں کیوں ہو



دم اے ملک الموت ذرا بہرِ خدا لے
واپس مرا قاصد درِ جاناں سے تو آلے

ہو جسکی خلش روح کو سرمایۂ لذت
کیوں کر کوئی وہ تیر کلیجے سے نکالے

اے نالۂ دِل اس پہ اثر ہو تو مَیں جانوں
بے فایدہ یوں عرش ہلانے کو ہلا لے

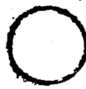
حسرت ہے کہ مُنہ سے کبھی سنوں نازکی باتیں
اونچی نِگاہوں سے مجھے دیکھنے والے

اے قادرِ مطلق ترے امکاں میں نہیں کیا
بے طور وہ بگڑے ہیں مری بات بنا لے

اللہ کو سونپا تمہیں عاشق نے سیدھارو
اللہ کرے پھر تمہیں عاشق کے حوالے

مٹتے ہیں مٹانے سے کہیں نقش وفا کے
اے حُسن مجھے صفحۂ ہستی سے مٹا لے

ایسا بھی ہے دُنیا میں کوئی بندۂ اللہ
للہ مرے روٹھنے والے کو منا لے



تیرِ ستم میں ان کے خلش بھی مزہ بھی ہے
وہ درد ہے جگر میں جو دل کی دوا بھی ہے

دم بھی خفا ہے وصل کی دل سے دُعا بھی ہے
جینا بھی ناگوار ہے فکرِ دوا بھی ہے

وہ دن ہیں کمسنی سے بغل گیر ہے شباب
شوخی کے ساتھ آنکھوں میں ان کے حیا بھی ہے

جانا سمجھ کے اے دل دیوانہ حشر میں
سنتے ہیں ان کا چاہنے والا خُدا بھی ہے

مجبور کچھ ہیں وہ بھی جو آئے ہیں دیر میں
شرمندہ آنے پہ میری خفا بھی ہیں

خاموش اب ہے اے دل دیوانہ کس لئے
محشر ہے آج وہ بھی ہیں تو بھی خُدا بھی ہے

کرتا ہے یاد وہ مجھے آتی ہیں ہچکیاں
دم وقت نزع سینے میں خوش بھی خفا بھی ہے

اے صدق اس تک اپنی رسائی ہو کس طرح
شل مثل پائے شوق کے دست دعا بھی ہے

سمجھ لے دیکھ کر خود نبض بسمل دیکھنے والے
دکھائیں کیا تجھے بے تابیٔ دل دیکھنے والے

ہوا ہے خاک اگر بن جا غبار پردۂ لیلیٰ
بگولے کی طرح اٹھ اٹھ کے محمل دیکھنے والے

ہنسی سمجھے تھے قلب مضطرب پر ہاتھ رکھ دینا
تڑپ کر رو دیئے بے تابیٔ دل دیکھنے والے

کمان غمزہ میں تیر نگاہ زہ کر چکا کوئی
نوید! اے جنبش مژگان قاتل دیکھنے والے

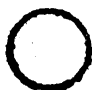
نہ چھوٹ جائے کہیں رنگ حنا دست حنائی سے
کف افسوس مل کر خوں بھرا دل دیکھنے والے

سوال وصل کا بس بس جواب اتنا ہی کافی ہے
ادا سے مسکرا دے روئے سائل دیکھنے والے

جو ٹکرا جس جگہ ہو وہیں رکھ دے تو بہتر ہے
مرا حسرت زدہ ٹوٹا ہوا دل دیکھنے والے

خدا شاہد یہ تری بےکسی ہے قابل عبرت
فلک کو یاس سے منزل بہ منزل دیکھنے والے

بتان شوخ کو دل دیکھنے کا صدق دعویٰ ہے
مرے اشعار تو دیکھیں مرا دل دیکھنے والے



دُعائے صبح و آہ نیم شب کیا کام آتی ہے
کہ جتنی تھی اب اس سے ہو گئی بے اعتنائی ہے

مروت ہے حیا ہے دوستی ہے دل ربائی ہے
فقط ان گل رخوں میں ایک عیب بے وفائی ہے

جواب خط لکھیں گے شرم انہیں غفلت پہ آئی ہے
حقیقت بھی ہے کچھ یا بات قاصد نے بنائی ہے

دُعا گالی نہ تھی کچھ ناک بھوں جس پر چڑھائی ہے
یہی تو ناز بے جا ہے یہی تو کج ادائی ہے

رہیں دم شماری سے شاکر اختر شماری ہوں
رفیق شب یہ ہے وہ مونس درد جدائی ہے

مری اچھی سی اچھی بات پر تیوری چڑھاتے ہیں
جنھوں نے بات بگڑی غیر کی اکثر بنائی ہے

سمجھتے ہیں وہ جذب سادگی کو یوں ہی بے پروا
وگرنہ حسن کی فطرت میں ذوق خود نمائی ہے

وہ کس کس ناز سے ذکر وفائے غیر کرتے ہیں
رہوں چپ تو برائی ہے کہوں کچھ تو برائی ہے

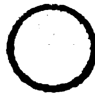
سمجھتے ہیں کہ گویا میرا مالک ہی نہیں کوئی
ستاتے ہیں ترے بندے کو یہ تیار دہائی ہے

ہمیں پر تھی نظر یا ہم ہی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں
کبھی وہ لطف تھا اب اس قدر بے اعتنائی ہے

خدا کا شکر ہے جیسی گزرتی ہے گزرتی ہے
کہوں کیا اس کو جس نے آگ سینے میں لگائی ہے

جواب لن ترانی پر بھی ہے اصرار موسیٰ کو
حقیقت میں اسی کا نام قسمت آزمائی ہے

نہ بدلی حسن کی فطرت زمانے کے بدلنے سے
وہی بے التفاتی ہے وہی بے اعتنائی ہے



غمزۂ دلکش ادائے جاں ستاں دیکھا کئے
وصل میں شب بھر قیامت کا سماں دیکھا کئے

فتنۂ گیتی فساد آسماں دیکھا کئے
دوست کو دشمن پہ کیا کیا مہرباں دیکھا کئے

آفت جاں ہے ترا اخلاص بھی اے بے وفا
لطف ظاہر میں ستم سو سو نہاں دیکھا کئے

کل اسی کوچہ میں کیا عالم تھا میرا کچھ نہ پوچھ
ایسی حالت تھی کہ تیرے پاسباں دیکھا کیے

لاگ تھی مانا مرے خرمن سے برق و باد کو
حیرت اس پہ ہے زمین و آسماں دیکھا کیے

میرے اٹھتے ہی درِ دولت سے رونق اٹھ گئی
چشم حسرت سے وہ اپنا آستاں دیکھا کیے

حالِ دل ہمدم مزے لے لے کے آج اس نے سُنا
ہم بھی خاموشی سے رنگِ داستاں دیکھا کیے

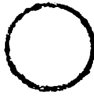
ان کے آتے ہی دگرگوں ہو گیا رنگ چمن
آہ گلچیں نے بھری سنہ باغباں دیکھا کیے

پاؤں پڑنے نے ہمیں نظروں میں ہلکا کر دیا
عمر بھر اس دن سے ان کو سرگراں دیکھا کیے

رشک تھا ہر ہر قدم پر ساتھ کوئے غیر میں
راستے بھر تیرے قدموں کے نشاں دیکھا کیے

مُفت سرگرداں رہے دیر و حرم میں عُمر بھر
فکر یوسف تھی نشان کارواں دیکھا کیے

بزم خوباں میں کھُلی خوبی کلام صدق کی
حسن کے پتلے بھی یہ حُسن بیاں دیکھا کیے



حسینوں دیر آشنا مشہور ہیں کہہ دے کوئی دل سے
خدا ملتا ہے آسانی سے یہ ملتے ہیں مشکل سے

صلہ درد محبت کا ذرا ملتا ہے مشکل سے
جگر سے تیر تو کھینچوں مگر کھینچوں گا کس دل سے

بہے کچھ آنکھ سے آنسو دھواں سا کچھ اٹھا دل سے
نسیم صبح نے آکر کہا کیا شمع محفل سے

ٹپکتی ہے کچھ ایسی یاس و حسرت چشم بسمل سے
کہ آ آ کر نکل جاتا ہے خنجر دست قاتل سے

علاج سوز دل اشکوں سے کیا ہو شمع کو دیکھو
بھڑک اٹھتی جہاں یہ آگ پھر بجھتی ہے مشکل سے

پھرے پروانہ گرد شمع میں تم پر نہ ہوں قرباں
اسے کہتے ہو کیا مجھ کو تو اٹھواتے ہو محفل سے

نہیں معلوم کیا جلوہ نظر آیا جو اب تک بھی
دھڑکتا ہے دل دیوانہ پہروں ذکر محمل سے

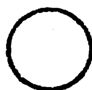
خدا کو بات رکھنی تھی کہ تم نے بھی ترس کھایا
کسی کو ورنہ یہ امید کب تھی جذبۂ دل سے

وہ عالم نزع کا وہ انتظار ان کا معاذ اللہ
نکلنے کو تو دم نکلا ہے لیکن سخت مشکل سے

سفینہ ہائے کس ناشاد کا دریا میں ڈوبا ہے
کہ موجیں رات دن سر اپنا ٹکراتی ہیں ساحل سے

وہیں مجنوں کے عقل و ہوش پر بجلی گرانی تھی
نکالا تھا جہاں منہ لے لیلیٰ نے محمل سے

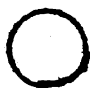
گلستان دکن میں صدق ہے گرم غزل خوانی
گلوں سے کہدو کیا سنتے ہیں اب نغمے عنادل سے



ناکام ترے مفت کا الزام نہ لیتے
دل کام کا ہوتا تو کیا کام نہ لیتے

سمجھے ہم کو سمجھنا تھا کہ یہ وعدہ ہے کس کا
کچھ تم کبھی تغافل سے بہت کام نہ لیتے

مانوس جو ہوتے خلش درد سے تم بھی
پھر دل کے دکھانے کا کبھی نام نہ لیتے



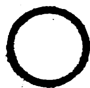
گو مجھ سے وہ برہم بھی ہیں ترچھی ہے نظر بھی
میں خوش ہوں کبھی دیکھ تو لیتے ہیں اِدھر بھی

زخمی نگہِ ناز سے دل بھی ہے جگر بھی
پیوست یہی تیر اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

ان کو بھی قرار اپنی جگہ اب نہیں آتا
کیا قہر ہے کم بخت محبت کی نظر بھی

کہنا بھی ہے کچھ ان سے کہا بھی نہیں جاتا
بے تاب بھی ہوں اور بگڑنے کا ہے ڈر بھی

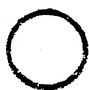
منہ پھیر کے اُٹھے مری بالیں سے وہ اے صدق
مطلب یہ ہے مرنا ہے اگر تجھ کو تو مر بھی



رُخصت اس بزم سے یوں صدق دل افگار نہ ہو
پھول جس طرح گُلستاں سے جُدا ہوتا ہے

چُپ تھے سوالِ بوسہ لب پر حیا سے وہ
میں سا کشش انتظار نہ کرتا جواب کا





ہمیں بھی یاد کرنا جب کھلیں کلیاں گلستاں کی
قسم ہے تجھ کو اے صبح وطن شام غریباں کی

بہار آئی اڑائیں دھجیاں پھولوں نے داماں کی
خبر لے تو بھی اے دست جنوں میرے گریباں کی

کہیں حسرت کا مدفن ہے کہیں تربت ہے ارماں کی
ترے عاشق کا دل تصویر ہے گور غریباں کی

اِدھر دیکھ او دلِ مضطر کی حالت پوچھنے والے
رقم ماتھے پہ ساری داستاں ہے دردِ پنہاں کی

کبھی اک تیر ناوابستگی میں دل نے کھایا تھا
خلش اب تک نہیں نکلی جگر سے اسکے پیکاں کی

وہی ظالم مرا قاتل ہے ان محشر خراموں میں
حنا سے جسکے بو آتی ہے یارب خونِ ارماں کی

نقابِ رخ اٹھا دی جس نے اسکو بھی تو کچھ کہئے
یہ مانا بزم میں ساری خطا تھی چشمِ حیراں کی



وصل کی رات ؎

کیسے اُمید تھی یوں کارگر جذبِ نہاں ہوگا
دلِ اِس پہلو میں اُس پہلو میں وہ آرامِ جاں ہوگا

تلافیٔ رنجِ فرقت کی وصالِ دوست سے ہوگی
پھریں گے دن خداوندِ دو عالم مہرباں ہوگا

بلائے گردشِ دوراں سے بے خوف و خطر ہوں گے
زمیں آرام دہ ہوگی فلک راحت رساں ہوگا

اِدھر وہ مہروش رونق فروزِ پہلوئے عاشق
اُدھر ماہِ مُبین زینت فزائے آسماں ہوگا

اُدھر چھٹکے ہوئے تاروں کے جھرمٹ میں مہِ تاباں
اِدھر پھولوں کی نازک سیج پر جانِ جہاں ہوگا

ضیا بار ایک ہی ساعت میں ہوں گے دو مہِ تاباں
وہ شب ہوگی کہ جس پر روزِ روشن کا گُماں ہوگا

رہے گا رات بھر پیشِ نظر وہ خوش نما منظر
کہ ہوگی رُوح کو بالیدگی دِل شادماں ہوگا

یہاں عجز و نیازِ عاشقانہ پیار کی باتیں
غرور و دلبری و نازِ دلداری وہاں ہوگا

نظمیں

غزلوں کی طرح نظمیں بھی عاشقانہ جذبات کے مرقع ہیں۔ درد و غم کی دل سوزی اور وصال کی سرمستی کو اسلوبِ بیان کی جدت نے بے حد دلکش اور اثر انگیز بنا دیا ہے۔

اِدھر ہر لحظہ عشقِ ناشکیبا داد کا خواہاں
اُدھر آمادۂ بیداد حُسنِ بے اماں ہوگا

وہاں ہوں گے ادائے حُسن پر وہ جس قدر نازاں
کہیں اس سے سوا نازاں اپنی قسمت پہ یہاں ہوگا

زبانوں کی کریں گی کام دونوں سمت سے نظریں
کسی پر خوبیٔ قسمت سے کوئی مہرباں ہوگا

کبھی ہنس ہنس کے ذکرِ آغازِ ایامِ محبت کا
کبھی رو رو کے اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہوگا

کبھی ہوگی شکایت شکر کے پردے میں غفلت کی
کبھی بے کھٹکے اظہارِ ستم ہائے نہاں ہوگا

کبھی خوئے جفا پر دل ہی دل میں منفعل ہوں گے
کبھی ذکرِ وفا بھی طبعِ نازک پر گراں ہوگا

کشیدہ عشق سے ہوگا کبھی حُسنِ حیا پرور
کبھی دونوں میں باہم ارتباطِ جسم و جاں ہوگا

کبھی دونوں طرف اک آگ سی بھڑکی ہوئی ہوگی
کبھی اک شرم کا ہلکا سا پردہ درمیاں ہوگا

سرور آنکھوں میں ساغر ہاتھ میں معشوق پہلو میں
زباں صدقؔ پر شکرِ خدائے دو جہاں ہوگا

کچھ نہ پوچھو

کیا کہوں تم سے مزہ کیا خود فراموشی میں ہے
ہوشیاری سے کہیں آرام بے ہوشی میں ہے

ضبط کی تاکید آئین وفا کوشی میں ہے
منہ سے کہتے ہیں سماں جو بات خاموشی میں ہے

کچھ نہ پوچھو چشم کیوں پُر نم ہے رُخ کیوں زرد ہے
کیا سناؤں داستاں میری بہت پُر درد ہے

داستان دل کا آخر کون سا ٹکڑا کہوں
وصل کا کھینچوں سماں یا ہجر کا قصہ کہوں

داستان قسمت کی یا تقدیر کا پھرنا کہوں
سرگذشت عشق طولانی ہے میں کیا کیا کہوں

کچھ نہ پوچھو چشم کیوں پُر نم ہے رُخ کیوں زرد ہے
کیا سناؤں داستاں میری بہت پُر درد ہے

ترک وفا کی قسمیں

توبہ ہے بس اب چاہ کا ارماں نہ کریں گے
دل لاکھ اُبھارے ضرر جاں نہ کریں گے

غیروں سے بھی ہے راہ تو ہم ربط سے گزرے
پھر ذکر وفا اے شہ خوباں نہ کریں گے

اے وحشت دل موسم گل آئے کہ جائے
پھر اب کے برس چاک گریباں نہ کریں گے

قطعہ

ہم نے تو یہ ٹھانی تھی کہ بس آج کے دن سے
بات اس سے کبھی تا حد امکاں نہ کریں گے

لیکن وہی ملنے کو بڑھا آپ سے جس وقت
پھر کہہ نہ سکے یہ تو مری جاں نہ کریں گے

آزردگی دل نہیں اے صدق گوارا
ہم اب سے کسی درد کا درماں نہ کریں گے

"نامۂ شوق"

پوچھے جو وہ نامہرباں زندہ ہے صدقؔ ناتواں
اے نامہ بر کہنا کہ ہاں کل تک تو آنکھوں میں تھی جاں

جس دم چلا ہوں میں اُدھر وہ زخمی تیر نظر
ہاتھوں میں تھامے تھا جگر روتا تھا لیکر ہچکیاں

دُھنستا تھا مثل شمع سر کہتا تھا ہر ہر سانس پر
اے سوز فرقت الحذر اے ضبط الفت الاماں

کہتے ہیں قسم کھاکے پریشانیٔ دِل کی
سودا ترا آئے زلف پریشاں نہ کریں گے

وہ بات ہے پہلی سی نہ وہ تاب جگر میں
سینہ ہدف ناوک مژگاں نہ کریں گے

یوسف بھی ہو وہ بت تو خریدار نہ ہوں گے
دنیا کے لئے دین کا نقصاں نہ کریں گے

ہرچند غم ترک محبّت ہے بُرا غم
بے وجہ خوشامد مگر اے جاں نہ کریں گے

وہ حُسن پہ مغرور ہیں ہم عشق پہ نازاں
بے وجہ خوشامد کسی عنواں نہ کریں گے

اس کشمکش ضبط میں گر جان ہی جائے
عیسیٰ سے مگر خواہش درماں نہ کریں گے

بھولی نہ اگر وعدۂ امروز کی خفت
فردا سے کبھی وصل کا ساماں نہ کریں گے

سر پھوڑیں گے پتھر سے مگر لوح جبیں کو
منت کش سنگ در جاناں نہ کریں گے

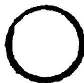
ہنس بول کے بہلائیں گے دل آج سے ہم بھی
اب شام و سحر گریہ پنہاں نہ کریں گے

محبوب و مغرور و حسین ناز آفریں و نازنیں !!
ناکام آنکھوں کے مکیں نادار دل کے میہماں

جب سے پھری تیری نظر رو رو کے ہوتی ہے بسر
گِنتا ہوں تارے رات بھر شاہد ہے اس کا آسماں

کر دے پھر اے رنگیں ادا روشن ہمارا غم کدہ !
تجھ پر نظر ڈالیں سدا حسرت سے خوبانِ جہاں

تجھ سے چمن اپنا رہے تو اے چمن آرا رہے
آگے ترے پھیکا رہے رنگ بہارِ بوستاں



بیمار و محروم دوا ناشاد و مشتاق قضا
ہمدم نہ کوئی ہم نوا، محرم نہ کوئی رازداں

صرف ایک تیری جستجو، حسرت نہ کوئی آرزو
ہو جب خود اپنا دل عدو کیسے رفیق و مہرباں

کھینچے تو کس کا آہیں نہ دیں بے لبس ہیں ہم نالے کہیں
بے سود جن کی کوششیں راتوں کی محنت رائیگاں

چھیڑا اسی سے جو ملا روداد غم کا سلسلہ
گہ تری فرقت کا گلہ گہ شکوۂ درد نہاں

خوش گو بہت دیکھے مگر دیکھا نہیں ایسا اثر
پانی ہو پتھر کا جگر اللہ رے حسن بیاں

گو نالۂ مستانہ تھا حال دل دیوانہ تھا
لیکن عجب افسانہ تھا روداد خستہ جاں

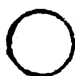
حسرت بھری تقریر تھی الفاظ میں تاثیر تھی
ہر بات اس کی تیر تھی ہر فقرہ اس کا تھا سناں

اے فتنۂ ایام سن اے دل بر گلفام سن
اس شخص کا پیغام سن جس پر کبھی تھا مہرباں

اے شمع بزم دلبراں اے رشک ماہ و مشتری
اے غیرت حور و پری سرتاج خوباں جہاں

نہرو جینتی

جناب صدق جائسی اپنی ملازمت کے آخری دور میں اورنگ آباد میں تھے اور وہیں سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ وہ کانگریس کو پسند کرتے تھے کانگریس کے زعما کی تعریف میں قطعات بھی لکھتے تھے۔ میرے دوست جناب مقتدر نجم صاحب نے دو نظمیں بھیجے ہیں جو درج ذیل ہیں۔ یکم دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء نہرو جینتی پر ——!



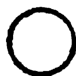
دیا روشن ہے بھارت میں خوشی کا
جنم دن ہے جواہر لعل جی کا

بہار تازہ آئی ہے چمن میں
دماغ افلاک پر ہے ہر کلی کا

بڑھا دی ملک کی عزت بڑھا دی
نہ تھا یہ کام تنہا آدمی کا

بجائے تحفہ لکھ بھیجیں گے ہم شعر
بُرا ہو اے عقیدت مفلسی کا

دُعائے صدق ایسا رنگ لائے
چُبھے کانٹا نہ کوئی دشمنی کا



تاریخ وفات

جب استاد جلیل کا سنہ ۱۹۴۶ء (۱۳۶۵ھ) حیدرآباد میں انتقال ہوا تو صدق حیدرآباد میں تھے۔ انہوں نے اپنے استاد کی تاریخ وفات لکھی۔ یہ قطعہ تاریخ جلیل نمبر مجلہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہے۔

وائے بر عالم جلیل استاد من
رفت سوئے خلد ۔ زین دار محن
در جوار حق بسا دا روح او
عنبریں بادا تنش زیر کفن
بر سخن را ہم خدا و ناخدا
گشت طوفانی کنون بحر سخن
او شہے بود در اوراق سخن
او نسیمے بود در اہل چمن
قائم اللیلے بدے شب ہائے تار
ذاکر الباطن بدے در انجمن
نکتہا ثبت است بر صفحات دل
گفتہا قند است در کام و دہن
شد فصاحت جنگ ۔ در ہندوستان
کان خطابش داد سلطان دکن
شاہ والا ہم بقدر ارزشش
وصف او سنجیدہ در سر و علن
سال فوتش صدق گفت و در بہشت
مرد استاد شفیق اہل فن

۱۳۶۵ھ

قطعہ تہنیت

اعلیٰ حضرت حضور نظام نواب میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع کے ابتدائی دورِ حکومت میں سر مہاراجہ کشن پرشاد مدارالمہام ریاست حیدرآباد اپنے عہدہ سے سنہ ۱۹۱۲ء میں سبکدوش ہوئے لیکن حسبِ فرمان آصف سابع دوبارہ سنہ ۱۹۲۷ء (۱۳۴۵ھ) صدرِ اعظم کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ جناب صدق نے اس مسرت میں قطعہ تہنیت مہاراجہ بہادر شاد کو پیش کیا تھا:

جس دن سے تھی صدارتِ عظمیٰ پہ قیل و قال
اہلِ دکن کے دل تھے عجب اضطراب میں

کس کس طرح سے وہم جماتا تھا اپنا رنگ
کیا کیا خیال اڑاتا تھا ہوش خواب میں

بیم و رجا سے مومن و کافر بسانِ شمع
آتش بجاں تھے فکرِ عذاب و ثواب میں

پیچ ایسا آپڑا تھا کہ اربابِ حل و عقد
رہتے تھے جس سے آٹھ پہر پیچ و تاب میں

رکھتی تھی اپنی دولتِ عظمیٰ بھی ایک رائے
مسند نشین بابِ حکومت کے باب میں

یہ بات تھی کہ طے نہیں پاتی تھی کوئی بات
تاخیر ہو رہی تھی سوال و جواب میں

خود بادشاہ کھوج میں مدت سے تھے مگر
جمتا نہ تھا کوئی نگہِ انتخاب میں

کیا ہو رہا ہے اس کی کسی کو خبر نہ تھی
مطلوب خود تمنا تھی ابھی تک حجاب میں

خالی نہ تھا یہ پردۂ حائل بھی لطف سے
ہوتا ہے حسن اور بھی دلکش نقاب میں

چھائی ہوئی گھٹا تو غم انگیز تھی مگر
دل بولتا تھا چاند بھی ہے اس سحاب میں

ناگاہ آئی مژدۂ تازہ لئے ہوئے
بادِ صبا بسی ہوئی عطرِ گلاب میں

شکر خدا کہ گلشنِ عالم کے دن پھرے
آئی بہار باغِ جہانِ خراب میں

اس کارداں کے ہاتھ میں آئی زمامِ ملک
جس نے دلوں پہ کی ہے حکومت شباب میں

قطعہ

جس ماہِ آسمانِ وزارت کے دور میں
ظلمت کا منہ کسی نے نہ دیکھا تھا خواب میں

چودہ برس کے بعد وہی چودھویں کا چاند
پرتو فگن ہے پھر شرفِ آفتاب میں

سن کر کہ حکمراں ہوئے ہیں جناب شاد
دوڑی خوشی کی لہر دلِ شیخ و شاب میں

کافر بتوں کے سامنے سجدے میں گر پڑے
زاہد نے شکر بھیجا خدا کی جناب میں

ذوقِ نگاہ شاہ کے قربان جائیے
ثانی کہاں ہے ان کا سیاست کے باب میں

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
اتنا تو حسن ہو نگہِ انتخاب میں

قطعہ

خالی ہے زر سے ہاتھ تو آیا ہوں شرمسار
دستِ یمینِ شاہ دکن کی جناب میں

ایسا ہے دل کا مجھ سے کہ گوہر نثار کر
موتی ہیں کچھ ابھی مری چشم پُر آب میں

قطعہ

سو بار امتحانِ ہنر میں رہا شریک
چہروں سے میری آنکھ نہ جھپکی شباب میں

لیکن جناب زر کہ ہیں حاجت روائے خلق
مجھ کو نہیں ہے بار جو ان کی جناب میں

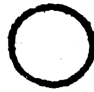
بے قدر بزمِ اہلِ ہنر میں ہوں اس طرح
کانٹا ہو جیسے پہلوئے برگِ گلاب میں

ہر بات بامزہ ہو تو اے صدق بات ہے
رنگین دُعا بھی چاہیے اس کی جناب میں

اے رنگ و بوئے گلشن امکاں کے بادشاہ
جب تک بو گلاب میں سُرخی شہاب میں

اے نور و نار عرصۂ ہستی کے بادشاہ
جب تک ضیاء رہے ماہ میں نور آفتاب میں

دولت جناب شاد کے قدموں سے نہ ٹلے
نُصرت رہے جلو میں سعادت رکاب میں



قطعہ

والا شان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر نے ایک عید کے موقع پر چند حسین و جمیل ارباب نشاط بمبئی اور دُور دراز مقامات سے بلوائے تھے جناب صدقؔ "دربار دُر بار" میں لکھتے ہیں: "وہ مہمان جو ہزارہا روپے خرچ ہونے کے بعد دُور دراز مقامات سے اس تقریب سعید کے لیے بلوائے گئے تھے اپنی مقررہ قیام گاہوں میں مقیم تھے۔ ان کی سیر و تفریح کے لیے لوٹیکساں پرنس کے اشارے پر مقررہ ٹیکسیں جو رات دن ان کے دروازہ پر حاضر رہتیں۔ . . . جس سڑک سے یہ سواریاں گزرتیں راہ چلتے تصویر حیرت بن جاتے معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے کچھ ستارے سرزمین حیدرآباد کی سیر کرنے اُتر آئے ہیں اسی طرح کی ایک سواری کے نظارے سے متاثر ہو کر میں نے اپنے تاثرات کا ان لفظوں میں اظہار کیا تھا۔" (ملخّصاً)

گل گشت کو نکلی ہیں اس شان سے کچھ پریاں
اِندر کے اکھاڑے کا نقشہ نظر آتا ہے

تسخیر ملائیک کی حاصل ہو جسے قدرت
اس حسن کا ہر دل پر قبضہ نظر آتا ہے

مصروف تماشہ ہے اک سرو خراماں بھی
بوٹا سا وہ قد کیسا زیبا نظر آتا ہے

ٹک ٹک سے دوست ایسا معشوق نہ دیکھا تھا
یارب تری قدرت کا جلوہ نظر آتا ہے

انساں تو کجا آگے اس صبح لطافت کے
رنگ گل نسریں بھی میلا نظر آتا ہے

ہنسنے میں دُرِ دنداں جس وقت چمکتے ہیں
غنچہ سا دہن کتنا پیارا نظر آتا ہے

ہر چند کہ مجمع میں بیگانہ سا ہے سب سے
ہر شخص کو لیکن وہ اپنا نظر آتا ہے

جس کی طرف اٹھتی ہیں کافر کی گھنی پلکیں
وہ نرگس جادو کا کُشتا نظر آتا ہے

نازک سی کلائی میں دلکش ہے گھڑی کتنی
تنگ ہے کہ انگوٹھی میں گویا نظر آتا ہے

اس حسن خداداد کی صحبت میں بہر صورت
نقش کف پا تیرا بنتا نظر آتا ہے

مخمّسہ

خمسہ یا مخمس شاعری کی ایک قدیم صنف ہے۔ کسی شاعر کی غزل کے مصرعہ یا شعر پر تین مصرعہ اس طور سے لگائے جائیں کہ تینوں مصرعہ اشعار ماقبل کے منشاء و مفہوم سے مربوط ہو جائیں اور اجنبیت ظاہر نہ ہو متقدمین سے متاخرین تک تمام شعرا کے دواوین میں غزلوں کے بعد جہاں دیگر اصناف شاعری کے نمونے ملتے ہیں خمسے بھی موجود ہیں۔

جناب صدق کے چند خمسے دستیاب ہیں جو اس صنف میں ان کی طبع آزمائی، ان کی زبان و بیان پر قدرت اور شاعرانہ کمال کا ثبوت ہے۔

اُستاد جلیل کی نعت پر خمسہ

اپنے اُستاد حضرت جلیل کی مندرجہ ذیل نعت کی جناب صدق نے تضمین کی ہے وہ بڑی ہی پُر اثر ہے جس سے عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والہانہ جذبات کی نہایت کیف آور ترجمانی ہوتی ہے جو مصرعہ اس پر لگائے گئے ہیں اتنے برجستہ اور موزوں ہیں کہ اس نعت شریف کا جزلا ینفک معلوم ہوتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان مصرعوں کے بغیر اصل نعت کا مفہوم تشنہ رہ جاتا!

جذب صادق کب دکھائے گا اثر یا مصطفےٰ!
شوق کامل کب بنے گا راہبر یا مصطفےٰ!
خاک یثرب ہوگی کب کحل البصر یا مصطفےٰ!
خواب ہی میں ہو کسی دن جلوہ گر یا مصطفےٰ!
ڈھونڈھتی ہے تم کو آنکھوں میں نظر یا مصطفےٰ!

فیض توفیق الٰہی جب سے خضر راہ ہے
با اثر ہر آہ ہے ہر بات خاطر خواہ ہے
فخر ہے آنکھوں کو، نازاں قلب حق آگاہ ہے
ایک خلوت گاہ ہے اور اک تجلی گاہ ہے
دیدہ و دل آپ کے دونوں ہیں گھر یا مصطفےٰ!

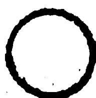
سینہ ریشوں کے لیے وجہ شفا حُسن ملیح
دردمندان محبّت کی دوا حُسن ملیح
زندگی میری بھی کر دے بامزہ حُسن ملیح
ہو نمک افشاں کسی دن آپ کا حُسن ملیح
چاہتا ہوں لذت زخم جگر یا مصطفےٰ!

کس کا منہ ہے قافلہ سالارِ امت کا بنے
خلق میں حامل نبوت یا امامت کا بنے
عاصیوں کے واسطے ضامن شفاعت کا بنے
اور ہے وہ کون جو سردار جنت کا بنے
آپ ہیں یا آپ کے نورِ نظر یا مصطفٰے

خطۂ جنت خنک ہے دل کو گرماتا نہیں
ذکرِ کاخ و شاخ سن لیتا ہوں للچاتا نہیں
باز پرس عرصۂ محشر سے گھبراتا نہیں
نام لیوا آپ کا ہوں اور کچھ آتا نہیں
رات دن یا مصطفٰے شام و سحر یا مصطفٰے

سبحۂ زاہد ہے اظہارِ مشیخت کے لیئے
شیخ کی ہو حق ہے اعلانِ کرامت کے لیئے
ظاہری ساماں کی کیا حاجت عبادت کے لیئے
چشمِ تر لے کر چلے ہیں ہم زیارت کے لیئے
اس سے چھڑکیں گے تمہاری رہ گزر یا مصطفٰے

نزع میں جب نفس کو صدق و صفا سے بیر ہو
ہوش اپنے کا نہ باقی امتیازِ غیر ہو
جلوہ گر تم ہو سرِ بالیں تو کیسی سیر ہو
اس جلیل خستہ جاں کا خاتمہ بالخیر ہو
دم نکل جائے تمہارے نام پر یا مصطفٰے



حضرت جامیؒ کی نعت پر خمسہ

تا کجا در جوشش وحشت دم سوئے صحرا کنم
تا بکے با چشم تر ہم چشمیِ دریا کنم
کئے دہد دستم کہ در راہش ز دیدہ پا کنم
کئے بود یا رب کہ رو یثرب و بطحا کنم
گہ بہ مکہ منزل و گہ در مدینہ جا کنم

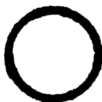
پست ہو جاتا ہے ناکامی سے دل کا حوصلہ
ہو کے شل گر پڑتے ہیں مایوس کے دستِ دعا
آپ تک آنے نہیں دیتا ہے بختِ نارسا
یا رسول اللہ بہ سوئے خود مرا راہے نما
تا ز فرقِ سر قدم سازم ز دیدہ پا کنم

ہجر کی اک آگ سینے میں ہے کب سے مشتعل
یہ تمنا ہے کہ جب ٹوٹے طلسمِ آب و گل
خاکِ دل کر دے ہوائے شوق در سے متصل
آرزوئے جنت الماویٰ بروں کردم ز دل
جنتم این بس کہ در خاکِ درت ماویٰ کنم

سوئے یثرب یوں چلا ہوں میں حزین و دل ملول
دامنِ غربت میں تیرے گلشنِ الفت کے پھول
زندگی ہجر کی وہاں ہو جائے گی محنت وصول
گرد صحرائے مدینہ بوئے آید یا رسول
جان خود را من فدائے خاکِ آں صحرا کنم

آرزو ہے جب زیارت کا ہو حاصل افتخار
دل جو پہلو میں تو سینے میں جگہ ہو بے قرار
یوں طواف روضۂ اقدس کروں دیوانہ وار
بر در باب السلام آیم بہ گریم زار زار
گہ بہ باب جبرئیل از شوق وا دیلا کنم

می خورم از دست غم خون جگر ہر لحظۂ
می فشانم لخت دل از چشم تر ہر لحظۂ
از زبان صدق ہستم نوحہ گر ہر لحظۂ
مردم از شوق تو معذورم اگر ہر لحظۂ
جامی آں نامۂ شوقِ دگر انشا کنم



تضمین غزل حافظ شیرازی

عشق تو بہ عقل رہنموں باد
درد تو دوائے ہر زبوں باد
زلف تو محرک جنوں باد
حُسن تو ہمیشہ در فزوں باد
رویت ہمہ سال لالہ گوں باد

اے کان صباحت و ملاحت
اے ماہ جبین و ماہ طلعت
اے معدن خوبی و لطافت
اندر سرِ من ہوائے عشقت
ہر روز کہ ہست در فزوں باد

اے زینت خاکدان عالم
اے رونق بوستان عالم
اے قاتل خلق وجان عالم
قد ہمہ دلبرانِ عالم
در خدمت قامتت نگوں باد

حاصل ہو کمال حسن تجھ کو
پروانہ ہو خلق شمع تو ہو
مرتے رہیں تجھ پہ زندہ ہیں جو

مرحبا کہ دلیست در غم تو
بے صبر و قرار و بے سکوں باد

گھیرے رہیں ترے در فدائی
چوکھٹ پہ سدا ہو جبہ سائی
دن دونی ہو شان خود نمائی

چشم تو ز بہر دل ربائی
در گردن سحر ذوفنوں باد

جھیلا ہے غم فراق بے حد
اللہ کرے بر آئے مقصد
اے لالہ عذار اے سہی قد

ہر کس کہ بہ ہجر تو نہ سازد
از حلقۂ وصل تو بروں باد

صدق است کہ راز دان حافظ
[1]...... ہمی در زبان حافظ
اے روح من و روان حافظ

لعلِ تو کہ ہست جان حافظ
دور از لب ہر خسیس و دوں باد

---

[1] پورا مصرعہ نہ مل سکا

حکیم مومن خان دہلوی کی غزل کی تضمین

مومن خان دہلوی مومنؔ کے کلیات میں ان کی دو غزلہ موجود ہے پہلی غزل کے اُنیس[19] شعر اور دوسری غزل کے چودہ شعر ہیں۔ دوسری غزل مسلسل اور یکساں مضمون سے ہم آہنگ ہے اور بطرز واسوخت کہی گئی ہے چنانچہ پہلی غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:

لکھ اور غزل بطرز واسوخت
مومنؔ یہ اسے سُنائیں گے ہم

معشوق کی کج ادائیوں سے دل شکستہ ہوکر دل کا بخار نکالا ہے اور خوب جلی کٹی سُنائی ہے اور ایک دوسرے طرح دار محبوب کو اپنا لینے کا انتباہ دیا ہے کہ تم نہیں اور سہی۔ مومنؔ، صدقؔ جائسی کے پسندیدہ شاعر تھے۔

مومنؔ کی غزل کے صرف پانچ شعر پر تضمین دستیاب ہے۔ یقین ہے کہ پوری غزل کی تضمین کی ہوگی۔ ان کا غیر مطبوعہ کلام جو ملے جتنا ملے غنیمت ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مومنؔ کی لے میں لے ملا کر ان کے انداز بیان کو خوب نبایا ہے اور یہی شاعر کا کمال ہے۔

کیا عشق سے باز آئیں گے ہم
اس کی تو قسم نہ کھائیں گے ہم
ہاں ضد پہ یہ کر دکھائیں گے ہم

اب اور سے لو لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

دل پر شب غم جو ہو گی بھاری
بہلائیں گے کر کے آہ و زاری
چھوڑیں گے نہ پاس وضع داری

گر تیری طرف کو بے قراری
کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

پوچھیں گے نہ اب کہ کیوں خفا ہو
اچھا نہیں بولتے نہ بولو
ہم بھی ہیں غیور یاد رکھو

دل دے کے اک اور لالہ رو کو
ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

آنکھوں پہ اگر رہا نہ قابو
پی لیں گے نظر بچا کے آنسو
شوخی سے کسی دن اے ستم جو

گر دیکھ کے ہنس دیا اگر تو
مُنہ پھیر کے مُسکرائیں گے ہم

جاتے تو ہیں تیرے در سے اُٹھ کر
جھیلیں گے جو آپڑے گی سر پر
ہے صدق گواہ اے ستم گر

بُت خانہ چیں سہی ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

ایک اور انداز سے اس شعر کی تضمین کی ہے:

خاتم میں نگیں سہی ترا گھر
تجھ سا ہی حسیں سہی ترا گھر
فردوسِ بریں سہی ترا گھر.

بُت خانہ چیں سہی ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم



مومن کی ایک غزل کا مقطع بہت مشہور ہے۔ صدق نے پوری غزل پر خمسہ لکھا ہوگا مگر افسوس صرف معروف مقطع ہی پر تضمین مل سکی جو اہل ذوق کے لیے تبرک ہے۔ نواب اصغر یار جنگ جب حج کو جا رہے تھے تو مومن کے اس مشہور شعر کی تضمین کی تھی:

عیش و نشاط محفل رندانہ چھوڑ کر
کیف و سرور شیشہ و پیمانہ چھوڑ کر
آب و ہوائے کوچۂ جانانہ چھوڑ کر

اللہ رے گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

استاد داغ کے ایک قطعہ

(صدمۂ ہجر)

پر تضمین ملاحظہ ہو:

خوش فکر سمجھتا ہو جسے صدق سا خوش گو
کس دل کو نہ غم ہوگا وہ مغموم اگر ہو
افسردہ و دل گیر و حزیں دیکھ کے اس کو

کل داغ سے پوچھا یہ کسی نے کہ بتا تو
کیا حال ہے اے بسمل صمصام جدائی

کس شوخ کے انداز تغافل کا ہے بسمل
کس شمع کا پروانہ ہے کس گل پہ ہے مائل
معلوم تو ہو باعث افسردگی دل!
سرشار ہے کیوں بادۂ اندوہ سے غافل
گردوں نے پلایا تجھے کیا جام جدائی

یہ کس کی محبت نے بنایا ترا نقشہ
لاغر ہے بدن، خشک ہیں لب زرد ہے چہرا
سب ہجر کے آثار ہیں صورت سے ہویدا
آنکھوں سے برستے ہیں دُرِ اشک تمنا
سینہ ہے ترا مخزن آلام جدائی

در پیش ہے کس دوست کی دوری کا تجھے غم
کس دشمنِ جاں کے لیے تیرا ہے یہ عالم
رہ رہ کے یہ کیوں سینے میں ہوک اٹھتی ہے پیہم

کیوں دل پہ ترا ہاتھ ہے کیوں چشم ہے پُرنم
ہے تجھ سے جُدا کون سا آرامِ جُدائی

حد بھی ہے کوئی رنج کی اے کشتۂ ابرو
بس کھینچ نہ آہیں نہ بہا آنکھوں سے آنسو
جینا ہے تو ملنے کا نکل آئے گا پہلو

آغازِ جُدائی کو جُدائی نہ سمجھ تو
ہوتا ہے وصال ایک دن انجامِ جُدائی

ممکن نہیں کیا چارۂ دردِ دلِ مضطر
لیکن ہے ہر اک کام کا اک وقت مقرّر
ہاں ہوگی تجھے دولتِ دیدار میسّر

ہاں صبر ہے درکار اس عربدہ جو سے
حسرت نہ کھُلی وصل کی ہنگامِ جُدائی

مرتا ہے مگر کس ستم آرا پہ مگر تو
کس کے لئے بے تاب ہے معلوم تو کچھ ہو
کیا محرم اسرار سمجھتا نہیں ہم کو

یہ عُمر کے کہا باتے نہ پوچھو یہ نہ پوچھو
کچھ اور کرو ذکر نہ لو نام جدائی

کس منہ سے کروں آہ میں اقرار محبت
شایان محبت نہ سزاوار محبت
چھیڑو نہ مجھے چھیڑ کے افکار محبت

احباب کر تھے واقف اسرار محبت
جھنجھلائے کر او مورد آلام جدائی

مرتا ہے مگر ضبط محبت کے ہیں دعوے
دے ان کو یہ نقرے جو نہ ہوں جاننے والے
واقف نہیں کون اس تری آشفتہ سری سے

ہم پوچھے کے احوال خطا وار ہی ٹھہرے
گویا کر دیا ہم سے یہ پیغام جدائی

بے جا نہیں تجھ سے ترے احباب کو نفرت
سچ ہے کہ نہیں رحم کے قابل تری حالت
بس دیکھ کے بے مہری ارباب محبت

اک نالہ کیا مرغ گرفتار کی صورت
مطلع یہ پڑھا اس نے تہہ دام جدائی

کیا پوچھتے ہو تلخی آلام جدائی
دشمن کو بھی پینا نہ پڑے جام جدائی
دل کانپتا ہے سن کے مرا نام جدائی

اللہ نہ دے گردش ایام جدائی
کم صبح قیامت سے نہیں شام جدائی

تضمین غزل ہادی

(ہادی تخلص ہے شاعر کا نام بیاض میں درج نہیں ہے۔)

چشم عاشق سے تو رہنا کہیں اچھا دل میں
عکس آنکھوں سے اتر آئے دوا پنا دل میں
ہو گئے دیکھ کے خوش اور یہ دنیا دل میں

دل میں آجاؤ بس اتنی ہے تمنا دل میں
ہم بھی دل کھول کے دکھلائیں کہ ہے کیا دل میں

رحم للہ کہ ہیں کب سے گرفتار عذاب
صدمۂ ہجر اٹھانے کی ہمیں اب نہیں تاب
ہو چکا عاشق بے تاب سے کب تک یہ حجاب

آؤ پہلو میں اٹھاؤ رخ روشن سے نقاب
شوق بے چین ہے پہلو میں تمنا دل میں

بے وفا تھے جگر و دل نے بہم ساز کیا
ایک نے دوسرے کو ہمدم و ہمراز کیا
تو نے کیوں اس پہ تاسف بت طناز کیا

دوست کو دوست کے مہماں نے سرافراز کیا
درد اٹھا جو کلیجہ سے تو ٹھہرا دل میں

دل ہے اتم کدہ جب سے بخدا اے کافر
محفل عیش نہیں اپنے پسند خاطر
آرزو ایک جو کی بھی تو ہوا یہ ظاہر

ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد آخر
بن گئی یاس در آئی جو تمنا دل میں

صدق سے راز چھپاؤ گے کہاں تک ہادی
ہمدم اک چاہیئے ممکن ہو جہاں تک ہادی
لہ...... کوئے بتاں تک ہادی

چل کے پہونچانے تمہیں آئیں وہاں تک ہادی
ہم سمجھتے ہیں جہاں کا ہے ارادہ دل میں

نواب سید یوسف علی خاں ناظم کی غزل پر مخمسہ

فردوس مکان نواب سید یوسف علی خاں والیٔ رام پور شاعر تھے اور تخلص ناظم تھا مرزا غالب سے کلام پر اصلاح لی۔ کہتے ہیں:

ناظم ہیں تتبع غالب پہ ناز ہے!
ہو گا کسی کو پیر دی میر پہ گھمنڈ

نواب سید یوسف علی خاں نہ صرف شاعر تھے بلکہ قدر دانِ سخن بھی تھے۔ غالب تو استاد تھے ہی لیکن اسیر لکھنوی، بحر لکھنوی، جلال لکھنوی، امیر مینائی، تسلیم لکھنوی اور داغ دہلوی جیسے استادانِ سخن ان کے دربار سے وابستہ تھے ان کی ایک غزل کی امیر مینائی اور استاد داغ نے تضمین کی ہے چنانچہ حضرت امیر کے دیوان "مرآۃ الغیب"

لہ پہلا مصرعہ نہ مل سکا۔

اور اُستاد داغ کے دیوان "گلزارِ داغ" میں یہ تضمین موجود ہے۔ جناب صدق نے ان اساتذہ سخن کے خمسوں کو پیش نظر رکھ کر اس غزل پر طبع آزمائی کی ہے۔ ہم نے اہلِ ذوق کی دل چسپی کی خاطر امیر داغ کے خمسوں کے ساتھ صدق کی تضمین بھی لکھی ہے۔ اس طرح لکھنے سے امیر و داغ جیسے سخنورانِ کامل سے مقابلہ اور تقابل مقصود نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ صدق نے کس حد تک اپنی شعری صلاحیتوں کو نبایا ہے اور زبان و بیان کے اظہار میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

امیر: کیا کیجئے وہ کہتے ہیں ہر بات پر غلط
اظہارِ غم کیا تو کہا سر بسر غلط
یہ دردِ دل دروغ یہ زخمِ جگر غلط
میں نے کہا کہ دعویٔ اُلفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

داغ: کہتے تھے وہ بشر کو جو دل دے بشر غلط
دیوانہ ہو کسی کا کوئی سر بسر غلط
شامت جو آئی ان کا بیاں جان کر غلط
میں نے کہا کہ دعویٔ اُلفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

صدق: الزام سنئے عہدِ وفا سر بسر غلط
قائم یہی رہے گی جواب ہے نظر غلط
مرتے رہو گے ہم پہ یوں ہی عمر بھر غلط
میں نے کہا کہ شیوۂ اُلفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

امیر: طوفان جوشِ گریۂ بے اختیار جھوٹ
آتش فشانیٔ جگرِ داغدار جھوٹ
زورِ کمندِ جذبِ دلِ بیقرار جھوٹ
تاثیرِ آہ و زاریٔ شبہائے تار جھوٹ
آوازۂ قبولِ دُعائے سحر غلط

داغ: ہوتی ہیں ایک بات کی تہہ میں ہزار جھوٹ
تصدیق کیجئے تو بس انجامِ کار جھوٹ
اور پھر ذرا یہ بول کے بے اعتبار جھوٹ
تاثیرِ آہ و زاریٔ شب ہائے تار جھوٹ
آوازۂ قبولِ دُعائے سحر غلط

صدق: تمہیدِ داستانِ دلِ بے قرار جھوٹ
تشریحِ واقعاتِ غمِ انتظار جھوٹ
تا دیل ذوقِ شوق بہرِ اعتبار جھوٹ
تاثیرِ آہ و زاریٔ شب ہائے تار جھوٹ
آوازۂ قبولِ دعائے سحر غلط

امیر: ہر روز ایک تازہ دکھاتے ہیں ماجرا
ہر وقت چھوڑتے ہیں شگوفہ کوئی نیا
جب آزمایئے تو نہ یہ سچ نہ وہ بجا
سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ افترا
سوزِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در غلط

داغ: یا لب پہ کوئی قطرۂ مے جم کے رہ گیا
یا کچھ عیاں ہوا اثر گرمئ فضا
یا جھوٹ بولنے کی خدا نے یہ دی سزا
سوز جگر سے ہونٹ پہ چھالا افترا
سوز فغاں سے جنبش دیوار و در غلط

صدق: اک داغ دل وہ مہر قیامت سے بھی سوا
جس وقت دیکھیے تپ فرقت میں مبتلا
خلق خدا سے شرم نہ کچھ خوف کبریا
سوز جگر سے ہونٹ پہ چھالا افترا
سوز فغاں سے جنبش دیوار و در غلط

امیر: ہاں داستان شکوۂ بخت زبوں دروغ
ہاں دل کے پیچ و تاب سے سوز جنوں دروغ
ہاں فرط غم سے جوشش سیلاب خوں دروغ
ہاں سینے سے نمائش داغ دروں دروغ
ہاں آنکھ سے طراوش خون جگر غلط

داغ: ہاں سچ نہیں حکایت حال زبوں دروغ
ہاں شکوہ و شکایت صبر سکوں دروغ
ہاں سر بسر دماغ میں جوش جنوں دروغ
ہاں سینے سے نمائش داغ دروں دروغ
ہاں آنکھ سے تراوش خون جگر غلط

صدق، شام وسحر شکایت گردون دون دروغ
آنکھوں سے بہر حکایت بخت زبون دروغ
ہاں زیر لب فسانۂ جوشش جنون دروغ
ہاں سینے سے نمائش داغ درون دروغ
ہاں آنکھ سے تراوش خون جگر غلط

امیر: ہیں سب بناؤ یہ ہمیں فقرے نہ دیجئے
ساقی صبح ہو تو صبوحی نہ پیجئے
ورنہ اپنے نہ ہاتھ کو بوسے نہ لیجئے
آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے
عشق مجاز و چشم حقیقت نگر غلط

داغ: ہاں بے بسی میں جرم و خطا کچھ نہ کیجئے
تسلیم و عاجزی کے سوا کچھ نہ کیجئے
ظاہر سوائے مہر و وفا کچھ نہ کیجئے
آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے
عشق مجاز و چشم حقیقت نگر غلط

صدق، کیا ضبط غم سے فائدہ آنسو نہ پیجئے
ہاتھوں میں بات بات پہ قرآں نہ لیجئے
نادان عیاں کریں فقرے نہ دیجئے
آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے
عشق مجاز و چشم حقیقت نگر غلط

امیرؔ: تسخیرِ یار کے لیئے یہ سب فریب ہیں
صاحب شکار کے لیئے یہ سب فریب ہیں
سمجھا میں پیار کے لیئے یہ سب فریب ہیں
بوس و کنار کے لیئے یہ سب فریب ہیں
اظہار پاکبازی و ذوقِ نظر غلط

داغؔ: آگے نہ تھے زمانے میں جو اب فریب ہیں
ایمان و دین و ملت و مذہب فریب ہیں
چلتے ہوئے بہانے ہیں بے ڈھب فریب ہیں
بوس و کنار کے لیے یہ سب فریب ہیں
اظہار پاکبازی و ذوقِ نظر غلط

صدقؔ: اصرار کر رہے ہو کہ یہ کب فریب ہیں
آنکھیں تو کہہ رہی ہیں کہ بے ڈھب فریب ہیں
قسمیں بتا رہی ہیں مہذب فریب ہیں
بوس و کنار کے لیئے یہ سب فریب ہیں
اظہار پاکبازی و ذوقِ نظر غلط

امیرؔ: بھولا سمجھ کے ہم کو جتاتے ہیں گرمیاں
کرتے ہیں مہر جب کبھی ہوتے ہیں مہرباں
ہم برسرِ زمین ہیں وہ بالائے آسماں!
لو صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں
احمق نہیں ہم اسکو نہ سمجھیں اگر غلط

داغ: یہ کذب یہ دروغ یہ بہتان الاماں
کیا جھوٹ بولنے کو ملی ہے انہیں زباں
شاعر بلا رہے ہیں زمین اور آسماں
لو صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں
احمق نہیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط

صدق: پہلے تھا سجدہ گاہ جہاں ان کا آستاں
پھر رفتہ رفتہ بار ہوا رشک آسماں
اندھیر کردیا کہ ہوئے اتنے مہرباں
لو صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں
احمق نہیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط

امیر: شیطان بھی تمہارے فریبوں سے مات ہے
تم دن کو دن کہو تو میں سمجھوں کہ رات ہے
اظہار ذوق قتل کی ساری یہ گھات ہے
کہنا ادا کو تیغ خوشامد کی بات ہے
سینے کو اپنے اسکی سمجھنا سپر غلط

داغ: کیا ہو یقیں جو کوئی کہے دن کو رات ہے
ہم جانتے ہیں ہیچ ہے یہ شب گھات ہے
ایسے مبالغے سے غرض التفات ہے
کہنا ادا کو تیغ خوشامد کی بات ہے
سینے کو اپنے اسکی سمجھنا سپر غلط

صدق: آجائیں ان کی باتوں میں ساری یہ گھات ہے
عارض ہیں دن کبھی تو کبھی زلف رات ہے
باز آئے اس سے ہم جو یہی التفات ہے
کہنا ادا کو تیغ خوشامد کی بات ہے
سینے کو اپنے اس کی سمجھنا سپر غلط

امیر: صاحب کہو وہ بات کہ ہو کچھ تو دل نشیں
جس کا نہ سر نہ پاؤں ہو اس کا ہو کیا یقیں
اس جھوٹ کی ہے بندہ لو انتہا کہیں
سینے میں اپنے جانتے ہو تم کہ دل نہیں
ہم کو سمجھتے ہو کہ ہے ان کی کمر غلط

داغ: معدوم تو وہ شئے ہے جسے لاکھ نکتہ چیں
ثابت کریں ہزار وہ ثابت نہ ہو کہیں
یہ بات کیا کہ دل تو نہ ہو اور ہو حسیں
سینے میں اپنے جانتے ہو تم کہ دل نہیں
ہم کو سمجھتے ہو کہ ہے ان کی کمر غلط

۱ کچھ خبر ہے نہیں نہ کہیں تم پہ ہم نشیں
بھولے سے ایسی بات نہ کہنا پھر اب کہیں
ہم کیا کسی کو بھی تو نہ آئے گا یقیں
سینے میں اپنے جانتے ہو تم کہ دل نہیں
ہم کو سمجھتے ہو کہ ہے ان کی کمر غلط

امیر: مطلب یہ ہے کہ لوگ کہیں لو وہ مر گیا
بیڑے میں عاشقوں کے عجب کام کر گیا
سن کر پیٹیں آشنا کہ وہ جی سے گزر گیا
ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا
مرنے کی اپنے روز اُڑائی خبر غلط

داغ: اُجرت پہ رونے والے مقرر ہیں جا بہ جا
میت کو ڈھونڈتے تو عدم تک نہیں پتا
یاں اس خیال سے کہیں ٹھہریں نہ بے وفا
ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا
مرنے کی اپنے روز اُڑائی خبر غلط

صدق: اس واسطے کہ خلق کہے کام کر گیا
تم نے سُنا وہ تم پہ جو مرتا تھا مر گیا
ناشاد نامراد جہاں سے گزر گیا
ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا
مرنے کی اپنے روز اُڑائی خبر غلط

امیر: عیاریوں سے بھی کوئی ہوتا ہے نیکنام
صاحب یہی ہے مکر تو بندے کا ہے سلام
یہ کون بک رہا ہے اگر ہم ہوئے تمام
پوچھو تو کوئی مر کے کبھی کرتا ہے کچھ کلام
کہتے ہیں جان دی ہے سرِ رہگزر غلط

داغ: اعجاز تو نہیں کہ جو قائل ہوں خاص و عام
گر کہیئے شعبدہ ہے محبت تو بس سلام
اب امتحاں سہی چلو قصہ ہوا تمام
پوچھو تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام
کہتے ہیں جان دی ہے سر رہ گزر غلط

صدق: ہر وقت موت ہی سے تو رہتا ہے تم کو کام
دیکھا اِدھر کسی نے کہ قصہ ہوا تمام
اللہ کس قدر ہے تمہارا خیال خام
پوچھو تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام
کہتے ہیں جان دی ہے سر رہگزر غلط

امیر: تم لاکھ قسمیں کھاؤ نہ مانوں گا میں کبھی
کیا جان اپنے ہاتھ سے کھونا ہے دل لگی
ناداں بنا رہے ہیں ہمیں آپ واہ جی
مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی
جان عزیز پیش کش نامہ بر غلط

آغ: اک آہ سرد بھر کے کیا طور بے خودی
اس کو دیا یہ دم کہ تجھے جان نذر کی
لو دینے والے ہوتے ہیں ایسے ہی تو سخی
مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی
جان عزیز پیش کش نامہ بر غلط

صدقؔ: لڑکوں کا کھیل ہوگیا ٹھہری نہ عاشقی
آنا ہے دل کا آپ کے نزدیک دل لگی
خیر اس کی اور بات تھی یہ ایک ہی کہی
مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی
جانِ عزیز پیش کش نامہ بر غلط

امیرؔ: اس شاعری پہ آپ کو اتنا نہ تانیئے
نقروں میں ہم نہ آئیں گے گو خاک چھانیئے
کیا مرض ہے کہ جھوٹ کو بھی سچ ہی جانیئے
آیت نہیں حدیث نہیں جس کو مانیئے
ہے نظم و نثر اہلِ سخن سر بسر غلط

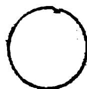
داغؔ: کیوں کر برابر آنکھ کے نرگس کو مانیئے
کس طرح بڑھ کے خلد سے مجلس کو مانیئے
سارے بیاں میں ہے غلطی کس کو مانیئے
آیت نہیں حدیث نہیں جس کو مانیئے
ہے نظم و نثر اہلِ سخن سر بسر غلط

صدقؔ: ہے اختیار آپ کو مرنے کی ٹھانیئے
یا کچھ دن اور خاکِ محبت میں چھانیئے
کیوں کر نہ اس بیان کو افسانہ جانیئے
آیت نہیں حدیث نہیں جس کو مانیئے
ہے نظم و نثر اہلِ سخن سر بسر غلط

اسیر: اس بے وفا کو عشق جتانے سے کیا ملا
الزام اٹھائے بیٹھے بٹھائے ہزار ہا
کہتا نہ تھا اسیر کہ اظہار ہے بُرا
یہ کچھ سُنا جواب میں ناظم ستم کیا
کیوں یہ کہا کہ دعوے الفت مگر غلط

داغ: جو عرض کی تھی داغ نے آخر وہی ہوا
کوئی خفا ہو آپ کو ہے چھیڑ کا مزا
دیکھا نا آخر آج وہ بدخو برس پڑا
یہ کچھ سُنا جواب میں ناظم ستم کیا
کیوں یہ کہا کہ دعوے الفت مگر غلط

صدق: کھٹکا تھا جس کا صدق کو آخر وہی ہوا
اظہار عشق پر وہ ستم گر برس پڑا
سچ ہے کہ ہو کے رہتا ہے تقدیر کا لکھا
یہ کچھ سُنا جواب میں ناظم ستم کیا
کیوں یہ کہا کہ دعوے الفت مگر غلط



ہجویں

جناب صدق فطرتاً ظریف الطبع، ذہین، صاف گو اور شاعر ہونے کے ناطے بڑے ذکی الحس بھی تھے۔ ذرا سی کج خلقی ان پر گراں گزرتی تھی ایسے اصحاب کی ہجو کی ہے جن سے انھیں ٹھیس پہنچی یا وہ عجیب الفطرت لوگ جن سے ناخوشگوار سابقہ پڑا۔ ان کی ہجو گوئی کا کمال یہ ہے کہ کسی کی ذات میں واقعی موجود شخصی کمزوریوں کو اپنے شاعرانہ حسن بیان کی تمام تر خوبیوں، تشبیہ و استعارہ کی دل آویزی، عام فہم الفاظ میں طرز ادا کی دلکشی اور طنز و ظرافت کی پُرکاری و رعنائی سے اپنی ہجوؤں کو آب و تاب بخشا۔ ان کی بعض ہجویں اردو ادب میں "ہجو ملیح" کے مثالی اعلیٰ نمونے ہیں۔

ہجو ملیح

جناب صدق اپنے لیئے کوئی موزوں ملازمت چاہتے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد صدر اعظم ریاست حیدرآباد ازراہ قدردانی ان سے وعدہ بھی کیا تھا لیکن تاخیر پر تاخیر ہو رہی تھی دل برداشتہ ہو کر یہ قطعہ لکھا:

اے سکندر حشم و حاتم و فیاض و رحیم
اے فریدوں خدم و بانی و ذی قدر و جلیل

ترے اخلاق تری نیک دلی پر شاہد
تیرے الطاف تری بندہ نوازی پہ دلیل

تری ہر بات حکیموں کے لیے قابل قدر
تیرا ہر فعل زمانہ کے لیے اک تمثیل

تیرا ہر لفظ ہے گنجینۂ معنی کا طلسم
تیرے ہر فقرے کی سو طرح سے ممکن تاویل

دستگیر اہل ہنر کی تری ذی حوصلگی
سیر چشمی تری ہر صاحب حاجت کی کفیل

شاعری میں مجھے حاصل تجھے بخشش میں کمال
مثل میرا ہی زمانے میں نہ تیرا ہی عدیل

فخر ممدوح کی عزت سے ہے مداح کو بھی
یہ وہ خوبی ہے تری شان ہے جسکی دلیل

شرم آتی ہے جو احباب کبھی پوچھتے ہیں
آج تیرے لئے کیا کوئی نکلی نہ سبیل!

دم ہے سینہ میں خفا اتنی بھی تاخیر ہے کیا
گو یہ تاخیر ہے معقد پہ درستی کی دلیل

شوق بے چین ادھر اور تمنا بے تاب
مدت وعدہ جاں بخش اُدھر طول طویل

ایسے وعدہ کو ہے درکار حیات الیاس
اس سے سر بر نہیں ہو سکتی مری عمر قلیل

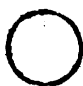
قدردانی تو ہے سو توڑ ترے دل پہ مگر
قابل داد نہیں کیا یہ اچھوتی تخییل

کس کی توہین ہے عالم میں اہانت میری
کس کی ذلت ہے زمانے میں رہا گر جو ذلیل

ہم زبان ہو کے مرا غالب آشفتہ بیان
تیری خدمت میں ان اشعار سے کرتا ہے اپیل

"نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل"

"قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل"



عرض حال

جناب صدق ظاہری وجاہت کے ساتھ ساتھ گفتگو بھی بہت پُر لطف اور دلچسپ انداز میں کرتے تھے۔ علمی و ادبی لطایف کے علاوہ وہ برموقع اشعار استعمال کرتے اور سب سے بڑھ کر اپنے مخاطب کے ذوق طبع کو ملحوظ رکھ کے اس سے ہم کلام ہوتے۔ اکثر اعلیٰ عہدہ داروں اور خوش باش ذی اثر لوگوں سے ان کی ملاقات رہتی۔ ان ہی میں نواب مہدی یار جنگ صدر المہام تعلیمات (حیدرآباد دکن) بھی تھے جن کے ہاں جناب صدق اکثر جایا کرتے مگر نواب صاحب کو بھول جانے کی عادت تھی۔ صدق کے قدر داں تھے۔ ان کے کلام کی دل کھول کے داد دیتے اور ان کی باتوں سے متاثر اور لطف اندوز ہوتے۔ ایک مرتبہ جناب صدق کا تبادلہ اضلاع پر کردیا گیا۔ نواب صاحب سے کہہ کے انہوں نے پھر حیدرآباد تبادلہ کرالیا۔ پھر ایک دفعہ کے بعد ان کا تبادلہ اور کسی ضلع پر ہوگیا تو انھوں نے ایک ماہ کی رخصت لے لی اور مقام تبادلہ پر رجوع نہیں ہوئے اور تبادلے کے لیے نواب مہدی یار جنگ کی خدمت میں حاضری دی اور اسی پیروی میں کئی بار نواب صاحب کے ہاں جانے لگے۔ نواب مہدی یار جنگ پہلے اے سی گارڈز کے ایک مکان میں رہتے تھے جس میں اب ٹاون پلاننگ آندھرا پردیش کا دفتر ہے۔ وہاں سے وہ بنجارہ ہل منتقل ہوگئے

یہاں انتہائی بلندی پر اپنی کوٹھی بنالی تھی۔ جناب صدق نشیب و فراز طے کرکے جب بھی پہونچتے اور تبادلہ کے لیے کہتے تو نواب صاحب عادتاً کہتے کہ ارے بھئی ہم تو نفل محمد خاں، ناظم تعلیمات سے کہنا بھول گئے، اچھی بات ہے ضرور ضرور آپ کا تبادلہ ہوجائے گا۔ اس طرح جناب صدق کئی بار نواب صاحب کی خدمت میں جاتے آتے رہے لیکن نواب صاحب یہی کہتے کہ ہم بھول گئے۔ ایک تو نواب صاحب کے ہاں جانا آنا دشوار، دوسرے شش ماہ حاصل کردہ رخصت کی مدت اِدھر ختم ہورہی تھی اور تنخواہ ملنے میں بھی دشواری ہورہی تھی۔ آخر تنگ ہوکر انھوں نے "عرض حال" کے عنوان سے نظم لکھی نواب صاحب، صاحبِ ذوق بھی تھے۔ جناب صدق جاتے تو فرمائش کرکے ان کا کلام سنتے تھے۔ ایک بار نواب صاحب کے ٹال مٹول سے دل برداشتہ ہوکر اٹھ رہے تھے تو نواب صاحب نے پوچھا کیا کوئی تازہ کلام ہوا ہے؟ جناب صدق کو موقع ہاتھ آیا اور انھوں نے حسبِ ذیل قطعہ اپنے خاص انداز میں سُنایا:

اے رفیع القدر نواب مہدی یار جنگ!
صوفیوں سے دیدہ و دل میں ہے وقعت آپ کی

آپ سے اشراف دُنیا کے پردے میں کہاں
سلطنت کا مول رکھتی ہے شرافت آپ کی

مردم سادات کا رُتبہ ہے آدم سے بلند
آپ سیّد ہیں یہ کیا کم ہے فضیلت آپ کی

سیدہ زہرہؓ کے آگے پایۂ حوا ہے پست
چشم باطن سے کوئی دیکھے سعادت آپ کی

آپ ہی کے جد ہیں سردار جوانانِ بہشت
دو جہاں میں ضوفشاں یکساں سیادت آپ کی

آپ ہی کا فیملی پوئیٹ، فرزدق سا ادیب
علم و فن کی قدر آبائی روایت آپ کی

آپ کا مسلک ہے اللہ و نبی کی معرفت
ہر جماعت سے ہے بالاتر جماعت آپ کی

آپ کے ہورٹ نے وعدہ پر دیا ہے اپنا سر
آپ کے وعدہ کی ضامن ہے شرافت آپ کی

کیمیا ہے آپ کا دیدار ہو جس کو نصیب
دیکھ لیتا ہوں میں ہر ہفتہ میں صورت آپ کی

پاس سے دیکھا تو پایا آپ کو اس سے بھی خوب
دور سے میں جس قدر سنتا تھا شہرت آپ کی

چھ مہینے ہو گئے وعدہ کو گستاخی معاف
آرزو میری ہے محروم عنایت آپ کی

اب تو میں پورا بھی اترا امتحان صبر میں
اب مجھے کیا حکم دیتی ہے مروت آپ کی

قول مرداں جاں بدارد وعدہ پورا کیجئے
مجھ کو یہ کہنے پہ اکساتی ہے شفقت آپ کی

میں تو خود گوہر ہوں گو قیمت میں ہوں بے آب و تاب
سنگ کو گوہر بنا دیتی ہے حکمت آپ کی

کر چکے ہیں آپ پہلے بھی مری مشکل کو حل
میری اک اک سانس ہے مرہون منت آپکی

جا پھنسا تھا "بیڑ" کے دلدل میں جب اک بار میں
کھینچ لائی تھی مجھے امداد و نصرت آپ کی

مٹ گیا وہ نقش دل سے صورت حرف غلط
یاد احسان کو نہیں رکھتی شرافت آپ کی

عاقلوں کا قول ہے نیکی کر اور دریا میں ڈال
بھول جانے کی بھی کیا اچھی ہے عادت آپکی

قدر کا خوگر ہوں ناقدری سے جی گھبرا گیا
شکر ہے لب تک نہیں آتی شکایت آپ کی

جب کسی مومن کے حفظ آبرو کا ہو سوال
اذن دے دیتی ہے ہجرت کا شریعت آپکی

مستعد ہجرت کو میں بھی ہوں مگر ہجرت کے بعد
صدق سے خالی نظر آئے گی صحبت آپ کی

آسماں بوس آپ کا ایوان سرکار ہے
دیکھتا ہے رشک سے کیواں بھی رفعت آپکی

آپ اگر چاہیں تو ہوں کرو بیاں سے ہم کلام
میل خود کھاتی نہیں غیروں سے غیرت آپکی

سعیٔ پئے ہم کیا کرے کوشش سے ہاتھ آتی نہیں
اس قدر اونچی ہے زنجیرِ عدالت آپ کی

جاں بلب جیتا ہوں جیتے جی مرے کام آئیے
حشر جب ہوگا تو چاہوں گا شفاعت آپ کی

رہتی دُنیا تک رہیں نام آور اور ممتاز آپ
ضو فشاں ہو مشرق و مغرب میں شہرت آپکی

صدقؔ کے موتی بہت سچے مگر بازار سرد
نرخِ ارزاں کو چڑھا سکتی ہے قیمت آپکی

نتیجتاً جناب صدقؔ کے اس قطعہ کا یہ کرشمہ ہوا کہ بہت جلد ان کا تبادلہ حیدرآباد ہو گیا۔ جناب صدق نے اپنی تصنیف "دربارِ دُربار" میں اس واقعہ کی طرف اشارۃً لکھتے ہوئے صرف چار شعر لکھے ہیں۔ اور بتایا ہے کہ "نواب کی قدر شناسی دیکھیے ایک ایک شعر پر پھڑکے۔ پورا قطعہ مزے لے لے کے سُنا۔ بڑی تعریف و توصیف کی اور وہ صلہ دیا کہ میرا دامن گوہرِ مقصود سے بھر گیا۔ ایسے سخن شناس اب دُنیا میں کہاں" (ص ۹۰)

قطعہ

در ہجو شیخ جی

جس زمانہ میں جناب صدق جائسی مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم میں اردو کے مدرس تھے تو اس وقت جناب احمد حسین خاں صاحب مدرسہ کے پرنسپل تھے۔ بعد کو انہیں ترقی ملی اور وہ مہتمم تعلیمات ہو گئے ان کی جگہ جناب شیخ ابوالحسن صاحب پرنسپل ہو کر آئے۔ وہ حیدرآبادی تھے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ ملکیوں سے زیادہ غیر ملکیوں اور ان کی قابلیت کے معترف تھے اور ہم وطنوں کی طرف التفات کم تھا۔ ان کی اس کیفیت طبع کو جناب صدق نے ملکیوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے طنز کے انداز میں واضح کیا ہے۔ جناب شیخ ابوالحسن صاحب کو باغبانی کا بہت شوق تھا۔ نونہال شاگردوں کو تعلیم و تربیت سے سنوارنے کی طرف توجہ کم اور جھاڑوں پودوں کی تراش خراش اور چمن کی تزئین و آرائش کا خیال زیادہ تھا۔ کلاس میں بچوں کو پڑھاتے وقت شیخ صاحب اپنے وسیع علمی معلومات کا جس طرح اظہار کرتے اور پھر ان کا ذوق خورد و نوش اور دیگر کارآمد مصروفیتوں کا ظرافت کے پیرایہ اور شاعرانہ انداز میں جو نقشہ کھینچا ہے وہ طنز و مزاح کا دلچسپ مرقع ہے کہ جسے دیکھ کر سنجیدہ آدمی کے چہرے پر بھی تبسم کی لہریں نمودار ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب زندگی زندہ دلی کا نام تھا۔ سننے والے خوش ہو کر داد دیتے اور جس کا خاکہ اڑایا گیا ہے وہ بھی لطف اندوز ہوتا:

افسوس کس عذاب میں مالی کی جان ہے
تگنی کا ناچ اس کو نچاتے ہیں شیخ جی

گرما کی تیز دھوپ میں آسیب کی طرح
سر پہ سوار بید ہلاتے ہیں شیخ جی

اٹھوا کے ایک جھاڑ کو رکھا تھا کل جہاں
آج اس جگہ سے اس کو ہٹاتے ہیں شیخ جی

محنت سے ایک شاخ لگاتا ہے وہ غریب
صد شاخ عیب اس میں لگاتے ہیں شیخ جی

کونڈوں پہ جو ریاض ہے لونڈوں پہ وہ نہیں
عمر اُن کی وقت اپنا گنواتے ہیں شیخ جی

اس درس گاہ خاص کو صد حیف وا دریغ
تفریح گاہ عام بناتے ہیں شیخ جی

واعظ کا ذکرِ خُلد تو سُنتے تھے اور بس
آنکھوں سے سبز باغ دکھاتے ہیں شیخ جی

کرتے ہیں فارسی کی طرف میل جب کبھی
روحِ حزیں کو وجد میں لاتے ہیں شیخ جی

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
حافظ کا اس کو شعر بتاتے ہیں شیخ جی

"اُعجازِ خُسروی" ہے کتاب قدیم ایک
اس کو جدید ڈھب سے پڑھاتے ہیں شیخ جی

صحرا میں معجزے کے بھٹکتا ہے اب ذہن
خسرو بھی اک نبی تھا بتاتے ہیں شیخ جی

انسان ہی ابھی پورے نہ بالکل ہی حبا نور
کھاتے ہیں دھان پان چباتے ہیں شیخ جی

دعوت میں پیٹ بھر کے جو کھاتے ہیں شیخ جی
ہر زیر و بم سے سُر کو سجاتے ہیں شیخ جی

پردیسیوں کے ساتھ سے مخصوص لگاہ لُطف
ہم ملکیوں سے آنکھ چراتے ہیں شیخ جی

خود داد و تیر دونوں مہینے ہیں لابھ کے
اچھی طرح سے ان میں کماتے ہیں شیخ جی

ہوتا ہے جو قرابت خویشی سے سرفراز
پہلے گریڈ اس کو دلاتے ہیں شیخ جی

سکھتے ہیں خوب خیر سے اور بولتے بھی ہیں
دُہری بہار ہم کو دکھاتے ہیں شیخ جی

احمد حسینؔ خاں نے لگایا تھا باغ جو
اس بوستاں میں آگ لگاتے ہیں شیخ جی

کیا خوب نظم و نسق صدارت ہے واہ وا
منہ صدر ماسبق کو چڑھاتے ہیں شیخ جی

لہ پرنسپل مدرسہ دار العلوم

لیلائے زر کے عشق نے مجنوں بنا دیا
خاک افسروں کے در پہ اڑاتے ہیں شیخ جی

ماتحت ان کے گاؤں کا نہیں ہے تو بے دریغ
سو سو طرح سے اس کو ستاتے ہیں شیخ جی

چندے سے روز اڑتی ہیں رندوں میں دعوتیں
کھاتے ہیں خوب اور کھلاتے ہیں شیخ جی

ان کی بلا سے مدرسہ چوپٹ ہو یا رہے
قدح کی اپنے خیر مناتے ہیں شیخ جی

آتی ہے بھیڑ مدرسہ والوں کے دام سے
شب دیگ اپنے گھر میں پکاتے ہیں شیخ جی

معمول بعد ظہر ہے حضرت کی سیر کا
افسر ہیں مطمئن کہ پڑھاتے ہیں شیخ جی

افسانہ راجہ جی کا ہے نوک زبان خلق
حق مستحق سے چھین کے کھاتے ہیں شیخ جی

یہ طرفہ ماجرا ہے کہ وقت نوشت و خواند
عینک اٹھا کے سر پہ جماتے ہیں شیخ جی

اسپیچ دیتے جاتے ہیں ڈٹتے بھی جاتے ہیں
گویا بہ جبر پیچ پلاتے ہیں شیخ جی

مشفق طبیب آپ کا مرہم فروش ہے
پالوش پا کو سر پہ چڑھاتے ہیں شیخ جی

قطعہ

در ہجو معین المہام متین الزماں خاں و نصیر المہام سر اسرار حسن خاں
شیخ الانشاء دبیر الملک

جناب ہوش بلگرامی (نواب ہوش یار جنگ) کا قیام بھی کسی وقت ریاست بھوپال میں رہا تھا۔ اپنی تصنیف "مشاہدات" میں انہوں نے نواب صاحب بھوپال اور وہاں کے بعض عہدہ داروں کا ذکر اپنے خاص دلچسپ انداز میں کیا ہے اور اپنی نوکِ قلم سے ان شخصیتوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ چنانچہ بھوپال کے ایک وزیر "سر اسرار حسن خاں" کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

سر اسرار حسن خاں شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے۔ سوٹ بوٹ بالکل انگریزوں کی طرح پہنتے تھے۔ انگریزی صرف "یس" اور "نو" بولتے تھے۔ کچھی اردو جانتے تھے۔ ان صلاحیتوں نے ان کو انگریزی حکومت میں ڈپٹی کلکٹر تک پہنچایا تھا اور بھوپال نے تو نصیر المہام بنا دیا۔ "شیش محل" میں رہتے تھے۔ میانہ قد تھا اور گندمی رنگ۔ برطانیہ کے وفادار تھے۔ غدر میں انگریزوں کو کوٹھریوں میں چھپایا تھا اس "حفاظتی صلہ" میں خان بہادر ہو گئے۔ سی۔ آئی۔ ای بن گئے اور نائٹ بھی اور اِن ہی حروف تہجی کی بدولت بھوپال میں کچھ سے کچھ ہو گئے"۔ [صـــ ۸۹]

جناب صدق بھی بہ حیثیت مصاحب، بھوپال کی ریاست سے وابستہ رہے تھے ان کو "سر اسرار حسن خاں" سے بھی واسطہ پڑا۔ سر اسرار حسن خاں کے متعلق ان کا اور ہوش بلگرامی کا نقطۂ نظر یکساں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہوش بلگرامی کی تحریر میں انشاپردازی کی شان نمایاں ہے اور صدق کا قطعہ شاعرانہ حُسن کلام اور طنز و مزاح کا مرقع :-

اک سرسری نظر ہو معین المہام پر
گو پیر ہیں پر اپنی اکڑ میں جواں ہیں آپ

کچھ گھڑے کی نشۂ منصب سے ہے چڑھی
سچ پوچھئے تو ہوش میں اپنے کہاں ہیں آپ

سمجھے ہیں دل میں اپنی بنگلیا کو رشک خلد
قبل از وفات خیر سے جنت مکاں ہیں آپ

اجلاس پر اگر ہوں تو نخوت کی حد نہیں
گویا جہاں ہے عرش معلیٰ وہاں ہیں آپ

موٹر پہ بار ہوں تھی سلیمان وقت ہیں
اس واسطے کہ صاحب تخت رواں ہیں آپ

کونسل سے کیس ہار کے اٹھیں تو شکل سے
معلوم ہو کہ فاتح ہندوستاں ہیں آپ

حسن چرٹ دھان وزارت پہ ختم ہے
مانند سگ کے منہ میں لئے استخواں ہیں آپ

افعال دیکھئے تو سفاہت کی انتہا
گر نام پوچھئے تو متین الزماں ہیں آپ

فضل و کمال شئے نصیر المہام کے
اسرار جن کا نام ہے سر نہاں ہیں آپ

ہر چند ان کے نام میں لکھنے سے بے خبر
لیکن دبیر ملک چنیں و چناں ہیں آپ

"نو" "تھانکس" "یس" "پلیز" کی پونجی ہے پاس صرف
اس پر یہ حسن ظن ہے کہ انگریزی داں ہیں آپ

اہل ادب میں لاؤ تو ہٹی کا ڈھیلہ ہیں
بزم طرب میں پاؤ تو روح رواں ہیں آپ

شیشہ پری کا گھر ہے کہ مسکن ہے دیو کا
بے شک مقیم "شش محل" میں کہاں ہیں آپ

گانٹھنگے پھر واعظ سواری جناب شیخ
گر سن لیا کہ ہوم میں ممبر یہاں ہیں آپ

"مسدس"

در ہجو جناب یتن صاحب المتخلص بہ طیش

ایک دفعہ لکھنؤ سے ایک لکھنوی صاحب حیدرآباد آئے اور پرنس معظم جاہ بہادر کے مہمان ہوئے۔ وہ پرنس کے نام راجہ صاحب محمود آباد کا سفارشی رقعہ لے کر آئے تھے۔ پرنس نے انہیں نظامیہ ہوٹل ٹھہرایا۔ ایک روز لکھنوی صاحب سب الحکم پرنس خاصے کی میز پر بیٹھے۔ جناب صدق بھی میز پر موجود تھے۔ پرنس نے ایک پلیٹ منگوا کر ادھ پاؤ بالائی نکالی اور دو لوز بادام اور دو پستے کے رکھ کے وہ پلیٹ لکھنوی صاحب کی طرف بڑھائی۔ پرنس نے ان سے کہا تم لکھنؤ کے رہنے والے ہو

جہاں کی بالائی مشہور ہے ذرا ہمارے ہاں کی بالائی بھی چکھو۔ جناب صدق دربار دُر بار میں لکھتے ہیں" اس گنوار نے وہ پلیٹ بغیر ادب و آداب لے کر چمچہ بھر بالائی منہ میں ڈالی پھر منہ ٹیڑھا کر کے بولا" ہوں یہ بھی بُری نہیں ہے"۔ جناب صدق کو اس بے عقیقت بات اور بد ذوقی و بے ادبی سے سخت کوفت ہوئی اور تعجب ہوا کہ راجہ صاحب محمود آباد نے اتنے بڑے دربار میں ایک غیر مہذب جانگلو کو بھیجا۔ جھمّن اس لکھنوی کا نام تھا اور طیش تخلص۔ پرنس کی فرمائش پر اس نے دو تین بیہودہ غزلیں سُنا کر سمع خراشی کی۔ جناب صدق نے اس طیش کی ہجو میں ایک مسدس لکھا اور طیش کو "پتن" کا خطاب دیا۔

شاعر ہیں میاں طیش کہ تفریح کا آلہ
برزخ بھی انوکھی ہے تخلص بھی نرالا
دشنام سخن تکیہ قسم منہ کا نوالہ
مجبور یہ کہنے پہ ہے ہر دیکھنے والا
نافہم ہے نااہل ہے ناچیز ہے پتن
گسیدی ولد الحیض خرہیز ہے پتن

تقدیر سے ہاتھ آئی تھی خاصہ کی ملائی
وہ خشک دماغی سے انہیں راس نہ آئی
بو سونگھ کے کتّے کی طرح ناک چڑھائی
کچھ جھوٹ نہ کہتی تھی بڑوں سے لگائی
نافہم ہے نااہل ہے ناچیز ہے پتن
گسیدی ولد الحیض ہے خرہیز ہے پتن

مجبور جو حضرت ہیں طبیعت کی اپج سے
دربار میں بیٹھے ہیں نئی سج نئی دھج سے
مطرب کی طرف ہیں نگراں دیدۂ کج سے
آنکھوں کے اشاروں میں پتا کہتے ہیں جج سے
نافہم ہے نااہل ہے ناچیز ہے پتن
گیدی ولد الحیض ہے خیر ہیز ہے پتن

دیکھا نہ سُنا آج تک ایسا کوئی احمق
شبرنگ ہو گھوڑا تو بتائے اسے ابلق
سمجھا ہوا ابجد کو اب وجد سے ہے مشتق
اس شعر پہ مستوں میں بپا ہوتی ہے ہو حق
نافہم ہے نااہل ہے ناچیز ہے پتن
گیدی ولد الحیض ہے خیر ہیز ہے پتن

دیکھے تو شرافت کے کوئی بے سر و ساماں
ناخواندہ وہ ہر شہر میں رنڈی کے ہیں مہماں
اللہ ہوئی کسبی تو بہن ورنہ ہے اماں
گھبرا ایک طرف ہنس کے یہ کہتے ہیں مسلماں
نافہم ہے نااہل ہے ناچیز ہے پتن
گیدی ولد الحیض ہے خیر ہیز ہے پتن

لہ نواب ناصر نواد اللہ

سجتی ہے جو ہونٹوں پہ بہت پان کی لالی
شل بُزنر بیٹھے وہ کرتے ہیں جُگالی
ہاتھوں میں ہے افیون کی میلی سی وہ پیالی
جورو جو ہے دیگیر تو کہتی ہے یہ سالی
نافہم ہے نااہل ہے ناچیز ہے یہ تین
گیدی ولد الحیض ہے خر ہیز ہے یہ تین

بیٹھے ہوئے کرسی پہ ہیں کیا دال کی صورت
گٹھنوں کے جو تیور ہیں تو دلال کی صورت
ممتاز خردل میں خرد جال کی صورت
کہتے ہیں یہ سب دیکھ کے خیلال کی صورت
نافہم ہے نااہل ہے ناچیز ہے یہ تین
گیدی ولد الحیض ہے خر ہیز ہے یہ تین

قطعہ

در ہجو غلیق درانی المعروف کرگس مکّہ

"یہ ہجو ایک استاد کی ہے جو جائیس کے کسی اسکول میں پڑھاتے تھے"

چلا مکّہ سا گدھ سوئے ٹریننگ
ہوا یہ سن کے ہر لڑکا فرحناک

کہ جا کر ہیٹ بیل کالج کی ماں کے
رہے گا تو مہینے بھر یہ ناپاک

بہت اچھا ہوا پھینکا گیا دور
چمن سے دوری بہتر ہے خاشاک

مگر نکٹے کو کیا اس بات کا غم
سوا بالشت یوں بھی بڑھ گئی ناک

برس میں یادگار بحر استاد
ہوئی طلاب کو تاریخ کی تاک

کہا لڑکوں نے آپس میں کہ یارو
کرو کوشش بقدر فہم و ادراک

اڑاؤ مولوی صاحب کا خاکہ
ادب کرکے پڑھو لکھو گے کیا خاک

پڑھا اک شوخ نے ہنس کر یہ مطلع
جو تھا ان جملہ گستاخوں میں بےباک

میاں جی تم بھی تھے پاکوں میں کیا پاک
رہے جب تک رہا اسکول ناپاک

رہیں گے یاد جب تک دم میں دم ہے
وہ موٹے لب وہ لمبی ناک

شب غم کی طرح کالی عبا وہ
گھنے سر پر کھارو کا سا اک چاک

وہ گھر گھڑیا تمہاری پاؤں گاڑی
وہ تم اڑے پہ یا پانی میں پیراک

مگس کی طرح تم کھانے پہ موجود
لگائے لاکھ پھاٹک پر کوئی لاک

ہوا لڑکوں کا آخر قافیہ تنگ
قوافی ملتے تھے ازبس کہ کاواک

کہا یوں مصرعہ تاریخ موزون
کہیں سب شکر ہے خس کم جہاں پاک

ہجو تلخ

کلیہ جامعہ عثمانیہ جب قائم ہوا تو اس کالج کے پہلے پرنسپل جناب عبدالرحمن خان صاحب مقرر ہوئے۔ وہ حیدرآبادی نہ تھے بلکہ مدراس ان کا وطن تھا۔ بہت اصول پسند تھے اور طبیعت کے تیز بھی۔ غیر ملکی ہوتے ہوئے ملکیوں کی طرف داری کرتے تھے۔ باب حکومت (کونسل) میں کلیہ جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری کے لیے تین اصحاب کی درخواستیں پیش ہوئیں جن کے نام ہیں مولوی عبدالحق، سید سجاد، اور مرزا تصدق حسین صدق جائسی۔ صدر کونسل، صدر المہام تعلیمات بھی ہوتا تھا۔ جناب عبدالرحمن خاں صاحب نے مولوی عبدالحق صاحب اور جناب سید سجاد صاحب کے ناموں کی سفارش کی اور جناب صدق کی درخواست پیش ہوئی تو ان کی جگہ کسی ملکی کو لینے پر زور دیا۔ ظاہر ہے کہ جناب صدق کو جناب عبدالرحمن خاں صاحب پرنسپل کے رویہ اور طریقہ کار سے تکلیف ہوئی۔ اپنی ناکامی پر ذیل کا قطعہ ان کے جذبات کا عکس ہے:

کہا کونسل میں صدر کلیہ نے
پٹک کر میز پر مسلوں کے گھٹے

ہمیں درکار ہیں یم۔ اے یہیں کے
مقدر سے وہ گھاڑ ہوں کر مٹھے

گئی جو لکھے میں اردو کی مہارت
مری فریاد پر مارو نہ ٹھٹھے

وہاں شیشم کی دھنی ٹھونستے ہو
جہاں فٹ بیٹھتے ہوں ساکھو کے لٹھے

پڑھے جو لوگ باہر سے ہیں دو چار
وہی ہیں چہرۂ کالج کے چٹے

یہ داغ لو نہ دو مجھکو خدارا
ابھی تازہ ہیں پہلے ہی کے گھٹے

نکلوا کر مجھے دم لیں نہ نکتنے
اگر دس پانچ مل بیٹھیں اکٹھے

تو جب یہ مجلس اعلیٰ نے ڈانٹا
ہمارا ستہ نہ کھا الو کے پٹھے

قطعہ

سر اکبر حیدری صدارت عظمیٰ ریاست حیدر آباد سے وظیفہ پر علاحدہ ہوئے اور ان کی جگہ حافظ احمد سعید خان نواب صاحب چھتاری سنہ ۱۹۴۱ء میں وزیر اعظم ہوئے مثل مشہور ہے کہ چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے ڈوبتے سورج کی نہیں ہوتی۔ یوں بھی شاعر کی ترقی کے لیے اس کی عرض معروضہ کی کوئی شنوائی سر اکبر حیدری نے نہیں کی تھی اس لیے نئے صدر اعظم کی آمد کی تہنیت میں جو اشعار جناب صدق نے لکھے وہ ان کے چوٹ کھائے دل کی پکار ہے:

اک دن کسی ملکی نے اک آزاد سے پوچھا
آن شوم کہ دی حاکم ما بود مگر رفتا

اب عادل و باذل کی حکومت کے ہیں ڈنکے
آن حاکم اول بہ سفر یا بہ سقر رفت

آزاد تو آزاد تھے بے ساختہ بولے
مارا چہ ازیں قصہ کہ گاو آمد و خر رفت

ملکی نے کہا اٹھ کے کہ یہ ارشاد ہے بے جا
سال است وہمیں فال کہ خیر آمد و شر رفت



رُباعیٔ

جناب صدقؔ "لکڑی کا پُل" میں مقیم تھے۔ یہ محلہ رسالہ حبوش (اے۔سی گارڈز) سے متصل ہے جناب صدقؔ کو ان دنوں ماما کی بہت تلاش تھی۔ بڑی تلاش کے بعد انھیں ماما ملی جو حبشن تھی۔ جناب شبلی یزدانی ان سے ملنے گھر گئے اور باتوں باتوں میں ماما کے بارے میں پوچھا تو جناب صدقؔ نے کہا ہاں ملی تو ہے مگر جی کڑا کر کے رکھ لیا ہے بارگاہ الہٰی میں شکوہ سنج ہوں کہ :

بہ شیفتہ گلاب و چمپا جوہی
شاکی ہے اگر فضول کہہ دے تو ہی
ماما بھیجی یا رب تو نے
مگر عجیب کل موہی



سلیمات

مولانا وحید الدین سلیم اردو کے ممتاز و معروف ادیب، نقاد، شاعر اور ماہر لسانیات تھے سنہ ۱۹۱۷ء حیدرآباد دکن آئے۔ دارالترجمہ عثمانیہ میں "وضع اصطلاحات" کمیٹی نے ان کی خدمات حاصل کیں۔ وضع اصطلاحات میں انھیں بڑی مہارت تھی ان کے بنائے ہوئے مصدر بہت مشہور ہیں جیسے برق سے برقانہ، شکر سے شکرانہ، نمک سے نمکانہ وغیرہ ان کی تصنیف "وضع اصطلاحات" اردو کی نایاب کتاب ہے۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ قائم ہوا تو وہ وہاں اسسٹینٹ پروفیسر مقرر ہوئے اور چار سال بعد صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ ہو گئے۔ ان کا انتقال ۱۹ر جولائی سنہ ۱۹۲۹ء ملیح آباد میں ہوا۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ میں اسسٹینٹ پروفیسری کے لیے جناب صدق بھی بہت کوشاں تھے لیکن قرعہ فال مولانا سلیم اور سید سجاد کے نام نکلا۔ جناب صدق کو ناکامی ہوئی۔ شاعر تھے دونوں کی ہجو لکھ کر دل کا بخار نکالا۔

مولانا سلیم پر مقالہ اور مضامین لکھے گئے ہیں جن سے ان کے علم و فضل اور حالاتِ زندگی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی شخصی کمزوریوں کا تذکرہ بھی مضمون نگاروں نے کیا ہے۔ تفصیل میں گئے بغیر مفصل کی بجائے مجمل ہی کہنا ہے۔ جناب فرحت اللہ بیگ صاحب نے "مضامین فرحت" میں مولانا سلیم کا حلیہ اس طرح لکھا ہے:

"متوسط قد، بھاری گھٹیلا بدن، بڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت اس پر سفید چھوٹی سی گول داڑھی۔ چھوٹی کرنجی آنکھیں۔" (ص ۱۵۴)

حیدرآباد میں مولانا سلیم ایک بڑے سے مکان میں تنہا رہتے تھے۔

بیوی بچے ساتھ نہ تھے۔ شمالی ہند کا ایک نوخیز لڑکا "الونڈا" نامی بہ حیثیت ملازم کام کرتا تھا اور لیکا تا بھی وہی تھا۔ مولانا سلیم صفائی پسند بالکل نہ تھے۔ روز آنہ منہ تک نہ دھوتے تھے۔ پان کے بہت شوقین تھے اور بہت زیادہ کھاتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں پائیریا ہو گیا اور دانت خراب ہو گئے۔ بہ این علم و فضل مذہب سے بالکل بے گانہ تھے ان کی آزاد خیالی کو دیکھ کر لوگ انھیں دہریہ سمجھتے تھے مگر اس کی انھیں کوئی پروا نہ تھی بلکہ وہ خود اپنے آپ کو نیچری کہتے تھے۔ معاصرین کی کوئی عزت ان کی نظر میں نہ تھی ان پر لعن طعن اور ان کو برا بھلا کہنے سے کبھی نہ چوکتے۔ کسی بھی دعوت میں بڑے شوق سے جانے کے عادی تھے۔ "بھتنی والے" ان کا تکیہ کلام تھا۔

مضمون نگاروں نے ان کا خاکہ اور ان کی جن کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے جناب صدق نے ان صداقتوں کو شاعرانہ حسن بیان کے ساتھ اپنی ہجو میں سمویا ہے۔ متذکرہ عنوان ان ہی کا تجویز کردہ اور لکھا ہوا ہے:

در جہل کر بخی آنکھ کو جب مٹکا دیا بھتنی والے نے
افسردہ دلانِ کالج کو برما دیا بھتنی والے نے

تقریر میں جب کچھ بن نہ پڑا مردک نے غشی کا سانگ بھرا
اس روز تو سارے مجمع کو جھانسا دیا بھتنی والے نے

اب کام ہمارا ختم ہوا کل سے ہے تمہارا کام شروع
جل دے کے بیریم اے والوں کو پھسلا دیا بھتنی والے نے

یہ پیر حرف لا مذہب ہے کہنے لگے ملت والے جب
اخبار میں صوفی مشرب ہوں چھپوا دیا بھتنی والے نے

ہر طرح کے پاپڑ بیلے تھے علامہ ہاپٹڑ[1] نے بھی مگر
ایسے کے تیسے یار کو بھی چکما دیا بھبتی والے نے

پوچھو نہ غزل خوانی کی ادا گویا کہ تماشہ ریچھ کا ہے
ہر سمت سے آتی تھی یہ صدا تڑپا دیا بھبتی والے نے

رہتا ہے جدھر کالج کا خر تم دوست علی[2] جانا نہ اُدھر
الوار بھی تھا رشک گل تر جھلسا دیا بھبتی والے نے

بھبتی ادھر چمکا کے چلا کالج میں ادھر یہ شور مچا!
سنڈا اس میں جو کا دانتوں کا جڑوا دیا بھبتی والے نے

لائف میں سلیمن کی ہے لکھا جب پیٹ میں تھی وہ نام خدا
اس بول پہ کیا رقص ہوا گھبرا دیا بھبتی والے نے

جس گھر سے اڑی دعوت کی خبر جس تھال میں دیکھا لقمہ تر
بگ ڈاک کی صورت بھاڑ سا منہ پھیلا دیا بھبتی والے نے

سانپ سیا بڑا سا اک ڈلہ ٹین کے عرق میں گھول دیا
افسوس شکر کی چائے کو بھی نمکا دیا بھبتی والے نے

مشہور[3] درندہ ایک جو تھا انگریز کے ٹیپہ خانے کا
اس شیر کے بزدل بچہ کو ہیٹوا دیا بھبتی والے نے

---

[1] مولوی عبدالحق [2] معلوم نہیں یہ کیا راز ہے [3] شاید یہ بھی کوئی واقعہ ہو!

قطعہ

قصیدہ در مدح جناب مشخت پناہ کمالات دستگاہ عالم جملہ علوم و ماہر سائر فنون ہفت اقلیم و ہفت زباں، شریں سخن و شیوہ بیاں، شیخ زادہ دشمنی باز، سیدنا و مولانا سابق مولوی گل خیر دصاحب الحال معروف بہ مسٹر چیڈا۔ اے۔ بی۔ آئی دام برکاتہ

یہ ایک ایسے پروفیسر کی ہجو ہے جن کی شخصیت کے تعارف میں جناب صدق نے مندرجہ بالا خطابات کو زیب عنوان بنایا ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جو (۵۵) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں صاحب ہجو کے علاوہ مولانا وحیدالدین سلیم سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی ہجو میں بھی چند اشعار شامل ہیں۔ اس ہجو کا پس منظر یہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں اردو کی پروفیسری باوجود کوشش جناب صدق کو نہ مل سکی البتہ ان کی بجائے میرٹھ کے سید سجاد صاحب کا بوجہ اعلیٰ ڈگری انتخاب ہوگیا۔ جناب صدق پر یہ بات بہت گراں گزری کہ کونسل نے محض ڈگری کی بنیاد پر سید سجاد کو جناب صدق پر ترجیح دی جب کہ صدق علم و فضل اور قابلیت میں ان سے بڑھ کر تھے۔

یہ نظم جس زمانہ میں لکھی گئی تھی اردو حلقوں اور ادبی محفلوں میں بہت مقبول و مشہور تھی۔ غرضکہ اس کا چرچا اس قدر ہوا کہ شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر نے اپنے درباری مصاحبوں کی محفل نشاط میں جناب صدق سے پڑھوا کر سنا اور خوب لطف اندوز ہوئے۔ آخر میں یہ فرمایا کہ "میری رائے میں اس ہجو سے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے" (دربار دُربار صفحہ ۲۰۹) حضرت فانی کہتے تھے کہ پوری ہجو میں غضب کی روانی و شگفتگی ہے۔ اور پھر فحاشی سے بالکل پاک (صفحہ ۲۰۸)

جناب سید سجاد صاحب حقیقت میں عجیب و غریب صفات و خصائل کا مجموعہ تھے۔ جناب صدق نے ان کی لیاقت علمی، خود نمائی، شعر فہمی ان کے عادات و اطوار، رفتار و گفتار، نشست و برخاست مختصر یہ کہ ہر ہر حرکت کا پُر لطف انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔ یہ نظم نادر تشبیہات و استعارات سے آراستہ ہے اور پھر اس پر لطف زبان مستزاد ہے:

پروفیسر صاحب اپنے آپ کو محض اس زعم میں کہ کچھ مدت وہ دہلی میں رہتے تھے زبان دان سمجھتے تھے۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے نظم کی ابتدا کی ہے:

پھاڑ ایک زمانے تک دلی میں اگر جھونکا
اس سے کہیں اُردو کا جلوہ نظر آتا ہے

میرٹھ کا لب و لہجہ چھپتا ہے چھپائے کب
ہر لفظ ہر اک فقرہ بھونڈا نظر آتا ہے

زباں داں ہونا تو بڑی بات ہے ان کا تو نہ اِملا درست نہ اِنشا!

دعوئے زباں دانی پھبتا نہیں اس منہ پر
اِملا میں غلط جس کا اِنشا نظر آتا ہے

گھر ہو یا کالج یا کوئی محفل ہو بلا قید زماں و مکاں سید صاحب جھوٹ کہنے سے کبھی نہ چوکتے۔ جہاں دیکھو اپنے اصلی روپ میں نظر آتے ہیں:

خلوت ہو کہ جلوت ہو وحدت ہو کہ کثرت ہو
سِفلے کو جہاں دیکھو سِفلہ نظر آتا ہے

مقصود ریاکاری ہر بات میں رہتی ہے
کم بخت تصنع کا پُتلا نظر آتا ہے

طبیعت میں شیخی ایسی کہ والد شیخ تھے مگر یہ اپنے آپ کو سید بتاتے ہیں:

حلقے میں مشائخ کے باباتو ہیں ہوتی ہیں
مسند پہ سیادت کی بیٹا نظر آتا ہے

لب و لہجہ کے بھونڈے پن کا یہ حال کہ معمولی لفظ "نیولا" کا تلفظ صحیح نہیں بول سکتے۔ دلی والوں کے لب و لہجہ کی نقل اتارنے کی کوشش میں تلفظ کی مٹی پلید کردی اور نیولا کہنے کی بجائے بڑی لٹک سے نیوٹیلا کہتے:

یوں جوش حماقت میں بک جاؤ تیؤ لو تم!
ہم کو تو وہ صدیوں سے نیولا نظر آتا ہے

علم تو صفر اور رائی برابر ہے مگر کمظرفی کا یہ عالم کہ اپنے آپ کو علم کا کوہ گراں سمجھتے ہیں:

پلے تو نہیں رائی اظہار ہے پربت کا
کم بخت طبیعت کا اوچھا نظر آتا ہے

نواب ذوالقدر جنگ بہادر معتمد سیاسیات و امور عامہ حکومت حیدرآباد تھے۔ وہ جامعہ عثمانیہ کی کونسل کے ممبر بھی تھے۔ یہ کونسل جامعہ عثمانیہ کے انتظامی امور کے علاوہ لکچرار اور پروفیسروں کا انتخاب بھی کرتی تھی۔ ڈگری ہولڈر دیکھ کر نواب صاحب نے پروفیسری کے لیے سید صاحب کا انتخاب کیا مگر جناب صدق جانتے تھے وہ کتنے پانی میں ہیں:

نواب کی نظروں میں عالم ہو کہ علامہ
یاروں کو تو الّو کا پٹھا نظر آتا ہے

کالج کے لڑکوں کو غالب کے اشعار کا مطلب سمجھاتے تو اسے مبتذل، کج فہم کے

ہاتھ میں دیوان غالب سجانا تھا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے لنگور کے ہاتھ میں خوشۂ انگور! غالب کی بلندیٔ فکر تک ان کی رسائی ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اپنی کم علمی کو چھپانے غالب کے بلند پایہ مضامین کو پامال بتاتے۔ وہ مثل کہ ناچ نہ جانوں آنگن ٹیڑھا۔

ہتیائے نہیں بیٹھے دیواں کو وہ غالب کے
بوزینے کے چنگل میں ہیرا نظر آتا ہے

لنگور نے پکڑا ہے انگور کے خوشہ کو
یا ریچھ کے قبضے میں پیڑا نظر آتا ہے

شاعر کا ہے مطلب کچھ سمجھے ہیں وہ کچھ معنیٰ
اب شعر ہے کیا گورکھ دھندا نظر آتا ہے

کہتے ہیں کہ کہیئے کیا پامال ہیں مضموں سب!
آنگن پئے رقص ان کو ٹیڑھا نظر آتا ہے

کیا ذہن کی جودت ہے وصف ید بیضا پر
ان کو کف موسیٰ میں انڈا نظر آتا ہے

اس فہم و فراست پہ ہر چند اڑیں ٹھٹھے
ان کو تو سڑا منہ خود سوندھا نظر آتا ہے

ل تا بعض دُر غلطاں پر گھونگھا نظر آتا ہے۔ (دربار دُربار)

کالج کے جن لڑکوں کو تھیس (THESIS) سوائے وہ اپنی کوشش اور صلاحیتوں سے پی۔ ایچ۔ ڈی ہو گئے مگر ان کی قابلیت کا یہ حال کہ خود پی۔ ایچ۔ ڈی نہ بن سکے۔ کورے کے کورے رہے۔

لکھوایا جنھیں تھیس وہ ہو گئے پی۔ ایچ۔ ڈی
پر خود وہی کورے کا کورا نظر آتا ہے

واقعی سید صاحب لکھتے وقت اُن کے قلم پکڑنے کا انداز عجیب تھا۔ دو اُنگلیوں اور انگوٹھے سے قلم پکڑ کر لکھا جاتا ہے لیکن سید صاحب مٹھی میں دبا کر لکھتے تھے جیسے کوئی درانتی پکڑ کر گھانس کاٹے۔

یہ کاٹھ کا اُلّو ہے چنگل سے قلم پکڑے
یا ہاتھ میں گھاس کے کُھر پا نظر آتا ہے

مولوی عبدالحق صاحب ان دنوں جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبہ اردو تھے۔ ان کا وطن ہاپوڑ (دلی) تھا۔ ان کی قابلیت مسلّم تھی ایسی ہمہ داں شخصیت کو سید سجاد خاطر میں نہ لاتے اور علم و فضل میں ان سے برتر سمجھتے مگر اس کا اظہار دبی زبان سے کرتے تھے۔ برملا اس لیے ان کے مقابل اپنی قابلیت جتانے کی ہمت نہ کرتے کیوں کہ مولوی عبدالحق ہمیشہ ہاتھ میں چھوٹا سا ڈنڈا رکھتے سید صاحب ڈرتے تھے کہ کہیں مولوی صاحب ان کی پٹائی نہ کر دیں۔

علامہ ہاپڑ تو سیدھے سے اک انساں ہیں
کیوں ان سے یہ کج دانش تیڑھا نظر آتا ہے

علامہ ہاپڑ کا سونٹا ہے جو موٹا سا
اس ہول سے حال اس کا پتلا نظر آتا ہے

ایک زمانہ تھا سید صاحب جرمنی تعلیم کے لیے جانے سے پہلے رومی ٹوپی اور دیسی لباس پہنتے تھے۔ تعلیم کے بعد جب ہندوستان لوٹے تو مولانا سے مسٹر بن گئے۔ کوٹ پتلون داڑھی مونچھ صفاچٹ اور سر پر ہیٹ بالکل چڈا یعنی انگریز

بن گئے۔ اسی وضع قطع کی تبدیلی پر طنز ہے:

> لمبی سی کل اک ٹوپی سرپوش تھی منڈیا پر
> اب ہیٹ کا چھتریا سر پہ چھایا نظر آتا ہے

> ایام جہالت میں تھا مولوی گل خیرو
> فیشن زدہ اب مسٹر جیدا نظر آتا ہے

یہ منہ دھو رہے تھے۔ دو طالب علم آگئے۔ ان سے پوچھا کہ بھئی کس صابن سے منہ دھوتے ہو۔ انہوں نے بتایا لکس صابن سے۔ سید صاحب جو سیہ فام تھے حیرت سے کہنے لگے بھئی ہم بھی اس صابن سے رگڑ رگڑ کے منہ دھوتے ہیں مگر رنگ میں تبدیلی نہیں آئی! شاعر کا اشارہ اسی بات کی طرف ہے:

> ہر چند رگڑتا ہے صابون سے چہرے کو
> اس پر بھی وہی کالا کوا نظر آتا ہے

حمام میں کوئی پانی نہائے تو تولیہ سے جسم خشک کر کے باہر نکلتے ہیں مگر سید صاحب کی عجیب سی عادت تھی۔ پانی نہایا۔ تولیہ اوڑھا اور بھیگے بالوں سے باہر آگئے۔ بھیگے بال چہرے پر پھیل جاتے تو کچھ اور ہی نقشہ نظر آتا۔

> حمام کے اندر ہے برزخ کا جدا عالم
> بھیگی تو نہیں بھیگا بلا نظر آتا ہے

عادت تھی کہ جاڑوں میں اوڑھے لپٹے کرسی پر اکڑوں بیٹھتے۔ ماما یا نوکر آکر کچھ پوچھتے تو ویسے ہی اوڑھے لپٹے گولا بنے ہوئے متوجہ ہوتے اس ہیت گذائی کا خاکہ شاعر کی زبانی سنئے:

> لپٹا ہوا کمبل میں پڑا ہوا چوکی پر
> کنگال کا لاوارث مُردہ نظر آتا ہے

ماما سے تھتھائے سنہ بیٹھا ہے جو چوکی پر
پھولا ہوا طاغوتی چوہا نظر آتا ہے

بیئے نوش نے سستی سی پی لی ہے جو تلچھٹ تک
خشتِ خم صہبا پر اوندھا نظر آتا ہے

سیّد صاحب موٹے اور بھدے تھے۔ اپنے کسی دوست کو سُنایا کہ ایک دفعہ وہ دلی ریلوے اسٹیشن پر اُترے تو پلیٹ فارم پر چند بھاری بھرکم پہلوان ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک پہلوان نے سیّد صاحب کے موٹے تازے ڈیل ڈول کو دیکھ کر اپنے ساتھی پہلوان کو حیرت سے کہا کہ بھیا یہ تو ہاتھی کا پاٹھا ہے۔

کس پیار سے کہتا تھا اک رستم دلی یوں
بھائی مرا ہاتھی کا پاٹھا نظر آتا ہے

سیّد صاحب کی ناک اُونچی تھی مگر بے ڈھنگی تھی۔ اس وجہ سے عینک ناک پر جمتی نہ تھی اُونچی ہو جاتی تھی۔ ایسا دکھائی دیتا جیسے کسی بچھو پر ٹڈا بیٹھا ہو۔ جب بے ڈھنگے چہرے پر عینک ہی نہ جمے تو کیا خاک دکھائی دے اس لیے ان کے نزدیک الف کا نام بھالا تھا۔

اس توسنِ بینی پر عینک کا نہیں آسن
بیٹھا رُخِ کژدم پر ٹڈا نظر آتا ہے

چہرے کی وہ آرائش، بینش کی یہ افزائش
ابجد کا الف ان کو بھالا نظر آتا ہے

موٹر میں بیٹھ کے نکلتے تو سید صاحب کا انداز نشست کچھ اس طرح ہوتا کہ جھکے ہوئے اور گردن آگے کو نکلی ہوئی۔ انگریز اپنے کتے کو موٹر میں بٹھا کر نکلتے تو پروفیسر صاحب کی بیٹھک بالکل انگریز کے کتے کی طرح ہوتی۔

تہذیب نشست اس کی موٹر میں کوئی دیکھے
انگریز بہادر کا کتا نظر آتا ہے

از بسکہ ہے آبائی یہ وحشت یکتائی
شوفر کی جگہ لوفر تنہا نظر آتا ہے

پروفیسر صاحب کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ دو لڑکے ان سے تولد ہوئے جو پروفیسر صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ بیوی کے انتقال کے بعد تنہا گھر میں رہنے لگے۔

سرمایہ کے دو چوزے مرغی تو ہوئی چمپت
اب ڈربے میں ٹٹروں ٹوں مرغا نظر آتا ہے

اپنی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی فکر میں تھے۔ ماما سے کہیں پیام لگانے کہتے تھے مگر ماما انجان ہو جاتی تھی۔ ماما اپنے سے زیادہ ان کے کٹنے پن کی قائل تھی۔

جو کہتے ہیں علامہ سُنتی نہیں قطامہ
کُٹنی کو وہ بھڑوا خود کُٹنا نظر آتا ہے

بعض وقت ایسا بھی ہوتا کہ دوست احباب انہیں عقد ثانی کا مشورہ دیتے تو یہ ہوڈیمو کہتے کہ شادی کی کیا ضرورت ہے۔ مالکن نہ سہی مالن سہی۔ ایک آدھ میں

صدق جائسی

ہمارا مقصد پورا ہوجاتا ہے۔

اک آنے میں اک بوسہ لے لیتے ہیں مالن کا
سیب ذقن ان داموں سستا نظر آتا ہے

کسی لیڈی سے معاشقہ کی کوشش کی مگر بُری طرح ناکام ہوئے۔ غصہ سے وہ لال پیلی ہوگئی۔ اور جھڑک دیا۔ بڑے شریف بنے تھے مگر گری ہوئی حرکتوں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔

ان مرشد کامل کی آخر جو کھُلی قلعی!
غصّہ سے رُخ اس مس کا تانبہ نظر آتا ہے

سید صاحب کا نظریہ حُسن عجیب تھا۔ حُسن کی تاویل وہ یوں کرتے تھے کہ پوشیدہ حُسن کوئی چیز نہیں بلکہ عریاں جسم کے خدوخال ہی میں حُسن کی جلوہ آرائی ہے اس لیے عشق مجازی کے سید صاحب جیسے رسیا عشق حقیقی کی جب بات کرتے تو ان کی قلعی کھل جاتی۔

اس عشق مجازی نے کھویا ہے بھرم سارا
اب حُسن حقیقی کا جویا نظر آتا ہے

یہ حُسن کی عُریانی رکھتی ہے یہی معنیٰ
معشوق بھی پیچھے کو ننگا نظر آتا ہے

حضرت ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے بڑے حضرت ابوالخیر مودودی جن دنوں حیدرآباد دکن میں رہتے تھے تو یہیں ابوالخیر مودودی صاحب کی شادی ہوئی تھی۔ دعوت ولیمہ میں انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے اسٹاف کو دعوت دی چنانچہ

سید سجاد صاحب بھی اس دعوت میں شریک ہوئے کھانا کھا کر واپس ہوتے وقت داعی سے مل کر انھوں نے شکریہ ادا کیا اور رسماً یہ بھی کہا کہ کھانا بہت اچھا تھا۔ کئی دنوں کے بعد آج خوب پیٹ بھر کھایا۔ جناب صدق بھی اس دعوت میں آئے تھے۔ سید صاحب کے اس بات کی بھنک ان کے کان میں پڑی انھیں مضمون ہاتھ آیا اور یہ شعر تخلیق ہوگیا۔

پیٹ اپنا ولیمہ میں بھر لینے دو مودودی
بے چارا کئی دن کا بھوکا نظر آتا ہے

سید صاحب روز صبح چہل قدمی (WALKING) کو نکلتے تھے۔ یہ پست قد تھے اور ان کے ساتھ ان کے ایک دوست ساتھ ہوتے جن کا قد اونچا تھا۔ ان اونچے دوست کے ساتھ سید صاحب جیسے پست قدیوں نظر آتے جیسے بڑی "ے" کے ساتھ ہمزہ (ء)

مانند سگ تازی ہمراہ ہے لمبو بھی
مانوس بڑی "ے" سے ہمزہ نظر آتا ہے

سید صاحب کے ایک اور دوست تھے جو واکنگ میں ان کے ساتھ رہتے جن کو یہ بڑے بھائی کہہ کے پکارتے۔ ان دونوں کے قدمیں جو فرق تھا وہ کچھ اس طرح تھا:

ہوتے ہیں بڑے بھائی جب واک میں ساتھ ان کے
بندر کی معیت میں بکرا نظر آتا ہے

چھوٹے قد کے سید صاحب جب چہل قدمی کو نکلتے تو جدھر جدھر سے گزرتے ایک تماشہ بن جاتے۔ یوں انچ کے علامہ نکلے ہیں مسی کرنے
اک فتنہ سا کوچہ میں برپا نظر آتا ہے

سید سجاد صاحب تعلیم کے لیے ہندوستان سے جرمنی گئے۔ دورانِ قیام جرمنی ایک جرمن لیڈی سے شادی کرلی۔ ڈگری لے کر جب وطن لوٹے تو جرمن لیڈی بھی ساتھ آئی نہ صرف جرمن بیوی آئی بلکہ اس کی بہن یعنی سید صاحب کی سالی بھی یہاں وارد ہوئی کہیں موٹر میں نکلتے تو ان کی نشست موٹر میں یوں ہوتی کہ خود تو بیچ میں بیٹھتے اور ایک طرف بیوی دوسری طرف سالی بیٹھی ہوتی :

ہمراہ جہاں دیکھو جورو بھی ہے سالی بھی
تثلیث کا حامی کب تنہا نظر آتا ہے

اس طرفہ مثلث کی ڈھونڈھی ہیں وہ تشبیہیں
مصری کی ڈلی جن سے مصرا نظر آتا ہے

سرخ و سفید، خوب صورت اور چاند سے چہروں والی لیڈیز کے درمیان کالے کلوٹے سے پروفیسر صاحب کا وجود ایسا دکھائی دیتا جیسے چاند پر دھبہ یا کالا سایہ:

ان چاند کے ٹکڑوں میں دھبہ ہے وجود اس کا
ان پریوں کی نسبت سے سایہ نظر آتا ہے

پروفیسر صاحب جن دنوں جرمنی میں زیرِ تعلیم تھے ایک حادثہ کا شکار ہو گئے اور ان کے ایک پاؤں میں لنگ آگیا اور وہ لنگڑا کے چلنے لگے۔ جب وہ حیدرآباد آئے تو ان کا طریقۂ کار یہ تھا کہ کہیں بھی جائیں واکنگ کو یا موٹر میں تو اُن کے بازو ایک طرف ان کی بیوی ہوتی دوسری طرف سالی۔ اس تہذیب نشست کی جناب صدق نے بڑی دلچسپ منظر نگاری کی ہے۔ انھوں نے جرمن لیڈیز کو "نجری" اور "دُسہری" سے تشبیہ دی ہے کہ یہ دو آم خوش رنگ اور خوش وضع اور ذرا لمبائی لیے ہوتے ہیں۔

جرمن لیڈیز کے چہرے خوب صورت ہوتے ہیں اور لمبوترے بھی۔ اس کے برخلاف "لنگڑا" بڑا مشہور آم ہے مگر بڑا بد وضع اور بد رنگ! جرمن لیڈیز کو فجری اور دسہری آموں کی مناسب شبہات کی فنکارانہ جدت کے ساتھ سید صاحب کی بدوضعی اور لنگڑے پن کی "لنگڑا" آم سے تشبیہہ شاعرانہ نکتہ آفرینی ہے۔ اس شعر کی تشریح نثر میں ممکن نہیں ہے۔

اک رشکِ دسہری ہے اک غیرت فجری ہے
خود بیچ میں دونوں کے لنگڑا نظر آتا ہے

اس ہجو میں سید صاحب کے بعض دوستوں کا بھی ذکر آگیا جو شاعر کی ہجو کا نشانہ بنے ہیں۔ جیساکہ مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہے۔ اسی طرح ان کے ایک دوست کسی کالج کے پرنسپل تھے جو دیو پیکر اور دیو سیرت آدمی تھے۔ ان میں اور سید صاحب میں خصلت کی یکسانیت کی وجہ بھیڑیئے اور کتے کی مماثلت تھی اور پھر ان کا حلیہ کچھ ایسا بدوضع اور ڈراونا تھا کہ ان کو دیکھنے سے ان کا سر یوں دکھائی دیتا جیسے اژدھے کے دھڑ پہ مٹکا۔

عفریت نما دھڑ پہ مٹکا سا ہے سر جس کا
اُس گرگ کا یہ سگ بھی گرگا نظر آتا ہے

اس ہجو کے حسبِ ذیل چند شعر اور ہیں جن کی تشریح سے ہم قاصر ہیں:

یہ بھاگتے پھرتے ہیں اس بزم میں یا وحشت
آتش پہ فضیلت کا پارا نظر آتا ہے

اک سیخ سی کھتے ہیں سینے میں در آئی ہے
ہر تار نفس غم کا بھالا نظر آتا ہے

صدق جائسی

یہ گنبدِ دوں یہ وڈیہ چرخ ستم گستر
بڑھیا کا انہیں اپنی چرخا نظر آتا ہے

ظاہر کے یہ فقرے ہیں باطن کی اگر پوچھو!
پانی سے بھرا منہ کا پیپا نظر آتا ہے

معشوق کی آنکھوں کا بھینگا ہے تماشائی
سودہ زدہ گیسو کا گنجا نظر آتا ہے !

ہاتھ آئی ہے ترکے میں فطرت جو حقیقت میں
ہر بیر کا پیڑ ان کو سدرا نظر آتا ہے

نظم میں مولانا وحید الدین سلیم کی ہجو میں چند شعر شریک ہیں۔ معلوم نہیں کتنے شعر اور لکھے تھے جو دستیاب ہوئے وہ پیش ہیں۔ مولانا سلیم پر ایک ہجو سلیمات کے عنوان سے پچھلے اوراق میں درج ہو چکی ہے جس میں مولانا کی افتادِ طبع اور شخصی کمزوریوں کا ذکر ہے۔

حسبِ ذیل عنوان جناب صدق کا فرمودہ اور لکھا ہوا ہے:
"منکر عنایت النعم مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی کی حیا سوز آتش افشانی"

کہہ دے کوئی زاہد سے خواب آپ کا سچا ہے
ہم کو تو ملب کوثر طوبیٰ نظر آتا ہے
پر طبع سلیم اپنی حوروں پہ نہیں مائل
بچپن ہی سے یہ رستہ ٹیڑھا نظر آتا ہے
جنت مری کالج ہے گلزار خدا رکھے
ہر طفل حسین غلماں قبلہ نظر آتا ہے

جناب صدق کے کلام پر استاد جلیل کی اصلاح

جناب ادیب حیدرآبادی نے صدق پر اپنے مضمون مطبوعہ ماہنامہ سب رس مارچ ۱۹۶۷ء میں لکھا ہے کہ شمالی ہند میں صدق، عزیز لکھنوی سے مشورہ سخن کرتے تھے اور حیدرآباد آئے تو حضرت جلیل کو اپنا کلام دکھایا۔ "دربار دُربار" کے مقدمہ میں صدق نے بتایا ہے کہ "کم و بیش آٹھ مہینے میں استاد جلیل کا شاگرد رہا" (ص ۹) جن جن اساتذہ سے اپنے کلام پر اصلاح لی اس کے نمونے عدم دستیاب اور ناپید ہیں۔ البتہ مجلہ عثمانیہ کے جلیل نمبر میں ان کے کلام پر استاد جلیل کی اصلاح کا نمونہ موجود ہے جو درج ذیل ہے :

اصل: پھولی پھلی شکایت درد جگر کہاں ÷ سیدھی ہوئی کسی کی وہ ترچھی نظر کہاں

اصلاح: ″ ″ ″ ÷ سیدھی ہوئی ابھی تری ترچھی نظر کہاں

اصل: وہ دل کہاں و لذت درد جگر کہاں ÷ سر ہی نہ رہ گیا تو رہے درد سر کہاں

اصلاح: ″ ″ ″ ″ ÷ سر ہی نہ جب رہا تو رہے درد سر کہاں

اصل: عقبیٰ ہوئی بخیر تو جنت کی سیر ہے ÷ جنت میں درد عشق کی دولت مگر کہاں

اصلاح: ″ ″ ″ ″ ÷ جنت میں درد عشق کی لذت مگر کہاں

اصل: سوال مدعا کرنے سے پہلے وہ ہوئے برہم ÷ جواب دل شکن ملنے سے پہلے ہی پشیماں تھا

اصلاح: سوال رحم کرنے سے وہ پہلے ہوگئے برہم ÷ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″

اصل: ترے مجنوں کے دم تک رونق صحرا تھی اے لیلیٰ
وہ جس دن چل بسا اک ہو کا گھر صحن بیاباں تھا

اصلاح: ترے مجنوں کے دم تک رونق صحرا تھی اے لیلیٰ
وہ جس دن چل بسا میدان اک ہو کا بیاباں تھا

عکس تحریر جناب صدق جائسی
بنام
جناب چودھری سلمان حسین صاحب
مددگار مہتمم خفیہ پولیس حیدرآباد

ایف ۱۱/۹۵ جدید محلہ بیگی

۱۷/ امرداد ۵۹ف

محترمی زاد لطفہ — تسلیم

حامل ہذا وہی طالب علم ہیں جن کا ذکر ایک بار آپ سے کرچکا ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں ان کو دین کی طرف بہت توجہ تھی اسی خبط میں دنیا ہاتھ سے جاتی رہی گو انہوں نے یونیورسٹی پر کئی سال حملے کئے مگر جیتے آدمی کے حملے کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہی ان کا ہوا یعنی ہر بار شاندار مراجعت عمل میں آئی اور یہ میٹرک کامیاب نہ ہوسکے اب ان کی حالت قابل رحم ہے اگر آپ کی مہربانی سے ضلع پولیس میں یہ کانسٹبل بھی ہوجائیں تو رزق کا سہارا ہوجائے۔ آئندہ یہ اپنا راستہ خود پیدا کرلیں گے کیونکہ تعلیم یافتہ ہیں۔ میں ایک مرتبہ حاضر بھی ہوا تھا مگر آپ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ زیادہ نیاز

صدق جائسی

اقتباس

گرامی نامہ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

بنام مصنف

آپ کی کتاب "دربار دربار" ایک نادر چیز ہے۔ آپ نے جس خوبی سے شاہزادے کے دربار اور وہاں کے امراء کے حالات اپنی دلکش نثر میں بیان کئے ہیں ان کو تاریخی حیثیت حاصل ہو جائے گی یہ آخری دربار تھا۔ اب نہ ایسے شاہزادے ہوں گے اور نہ ایسے دربار اور نہ آپ جیسے لکھنے والے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب نہایت مقبول ہوگی اور اردو ادب میں اسے خاص مقام حاصل ہوگا۔

("دربار دُربار")

دَربار دُربار کی اہمیت

جناب صدق جائسی چھبیس[۲۶] برس حیدرآباد میں رہے۔ ان چھبیس[۲۶] سالوں میں سات سال نواب معظم جاہ کے اعزازی مصاحب ہونے کا انھیں شرف ملا۔ ملازمت سے وظیفہ کے بعد حالات سے دل شکستہ ہو کر مجبوراً شہر حیدرآباد کو الوداع کہا اور اپنے وطن جائس چلے گئے۔ جائس میں ان کے لیے کیا رکھا تھا۔ بقول ان کے وہاں بے خردی اور جہالت کا دَور دَورہ تھا۔ سوسائٹی کے فقدان اور گھر کی تنہائی سے گھبرا کر غم غلط کرنے ان خوشگوار لمحات اور دلچسپ واقعات کے لکھنے کا شغل اختیار کیا جنھیں نواب معظم جاہ بہادر کے دربار میں بہ چشم خود دیکھا تھا۔ اپنے نوک قلم سے دکن کے شہزادہ کے شبانہ دربار کی اپنے دلکش پیرایۂ بیان میں ایسی عکاسی کی کہ کتاب کا ہر ورق واقعات کی تصویر دِکھائی دیتا ہے اور پھر اپنی فطری بذلہ سنجی اور خوش طبعی سے ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ قاری حیرت انگیز واقعات کے تسلسل میں محو ہو جاتا ہے اور ختم ہونے تک

کتاب ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ وہ شاعر تھے ہی لیکن دربار دُربار ان کے طرزِ خاص کے انشا پرداز ہونے کا ثبوت بھی ہے۔ آپ اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن کتاب لکھ کر ایک مورخ کا فرض بھی انجام دیا ہے۔ دَربار دُربار ایک تاریخی دستاویز اس لیے ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جس میں دکن کے ایک شہزادہ اور اس کے شاہانہ دربار کے چشم دید واقعات محفوظ ہیں۔ عہدِ آصف جاہی کے کسی بادشاہ یا شہزادہ کے دربار پر ایسی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ جناب صدق پر صدق بیانی سے انحراف کا الزام ہے کہ اظہارِ بیان میں بعض جگہ دروغ گوئی کی پیوند کاری کی ہے ایسا ہو سکتا ہے کیوں کہ کوئی مورخ یا ادیب اس الزام سے کس حد تک بچا ہے؟ چہ میگوئی کرتے وقت یہ بھی غور کرنا ہے کہ یہ کتاب شائع ہوئی تو اس وقت شہزادہ نواب معظم جاہ کے کئی مصاحب اور حاضر باش درباری بہ قیدِ حیات تھے ان میں شاعر اور ادیب بھی تھے۔ وہ یہ تو کر سکتے تھے کہ کوئی مضمون لکھ کر ثبوت کے ساتھ غلط بیانی کی تردید کرتے یا اپنی طرف سے صحیح واقعات پر مشتمل کوئی کتاب تصنیف کر دیتے مگر کسی نے کچھ نہیں کیا۔ جناب صدق حیدرآبادی نہ تھے ان کا تعلق شمالی ہند سے تھا اس کے باوجود دکنی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے دکن کے شہزادہ کی شخصیت کا ہر موقع پر احترام ملحوظ رکھا اور حالاتِ دربار لکھتے وقت قلم کو حدِ ادب سے آگے نہیں بڑھایا اور تمسخرانہ اندازِ بیان نہیں اپنایا۔ اگر دَربار دُربار شائع نہ ہوتی تو ہم حیدرآبادی خود شہزادہ نواب معظم جاہ کے حالاتِ دربار سے ناواقف رہتے جیسے آج ہم دکن کے درباروں اور سرکاروں سے ناواقف ہیں۔

(مصنف کتاب ہذا)

خط بنام صدق جائسی

جناب صدق شراب کے رسیا تھے نہ عادی۔ کسی ریاکاری اور مصلحت سے کام نہ لیتے ہوئے انہوں نے صاف صاف دَربار دُربار میں لکھا ہے کہ جب شہزادہ نواب معظم جاہ نے اپنی ایک خاص محفل میں انہیں شراب پینے مجبور کیا تو انھوں نے

عرض کیا" سرکار مجھے اس سے معاف فرمائیں، پینا تو کجا میں نے تو آج سے پہلے
اس کی شکل بھی نہ دیکھی تھی"۔ (ص۸۱) لیکن نواب معظم جاہ کے شاہانہ اصرار اور
مجبور کرنے سے زندگی میں پہلی بار جام بلوریں سے چند گھونٹ حلق سے اتارے
اس وقت انھیں اپنے وطن جائس کے ایک بزرگ دوست قاضی میر محمد صاحب
کی پیشن گوئی یاد آگئی۔ وہ لکھتے ہیں:

"اوائل عمر میں قاضی میر محمد صاحب نے میرا زائچہ بنایا تھا جس میں من جملہ
اور پیش قیاسیوں کے ایک پیشن گوئی یہ بھی تھی کہ ایک دن شراب بھی پیو گے۔ میں
نے اس وقت برا مانا تھا مگر قاضی صاحب نے یہ کہہ کر معذرت کی تھی کہ میں تو وہ بات
کہتا ہوں جو تمہارے ستاروں کی رفتار کہتی ہے۔ اپنی طرف سے ایک بات بڑھاتا ہوں
تو کافر۔ لیکن مدت کے بعد وہ پیشن گوئی اس طرح پوری ہوئی" (ص۱۰۲)

صدق نے قاضی صاحب کے جس خط کا ذکر کیا ہے وہ ہمارے ہاتھ میں ہے اسے
میں نے حضرت شبلی یزدانی صاحب سے مانگ لیا تھا کہ شاید کسی کام آئے اس خط کی اس لیے
اہمیت ہے کہ اور باتوں کے علاوہ اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ صدق اوائل عمری
سے شاعری کرتے تھے اور فن تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ قاضی میر محمد صاحب کے
خط کا اقتباس درج ذیل ہے:

...... مدت مدید کے بعد یاد کر کے متشکر کیا۔ این ہم غنیمت است کہ یادم گہے گئی
... خواب میں آپ نے ہلال دیکھا تھا اس کی تعبیر فقیر نے دی تھی۔ یہ اسی کا ظہور ہے
جو باتیں میں اپنے چشم دل سے دیکھ رہا ہوں ان کا اظہار قرین مصلحت نہیں مدت سے آپ
مجھ کو قلندر کہتے تھے یاد رہے قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔ الحمد للہ کہ استاد نے اب
آپ کو سند فضیلت عطا فرمائی مگر میں تو بہت پہلے دستار فضیلت آپ کے سر
باندھ چکا ہوں۔ آپ کی شاعری کا مداح خواں اس وقت سے ہوں جب آپ کا شمار بچوں
میں تھا آپ پیدائشی فطری شاعر ہیں۔ سخن فہم آپ کی توصیف میں رطب اللسان رہے گا....
قطعات تاریخ کو پڑھا بے حد لطف آیا خوب ہیں۔ تاریخ لکھنے میں بھی آپنے کمال حاصل کر لیا۔
غزلیں تو مشتاق غزل تھا۔

نیاز کیش: میر محمد

مورخہ: ۲۸/ فروری/ ۱۹۳۱ء

مُرتّب کی دوسری کتابیں!

1. سوانح عمری صفی اورنگ آبادی مطبوعہ ۱۹۸۷ء
2. صاحبزادہ نواب صلابت جاہ 〃 ۱۹۸۹ء
3. تاریخ و ادب 〃 ۱۹۹۲ء
4. کلامِ صفی اورنگ آبادی (غیر مطبوعہ) 〃 ۱۹۹۳ء